یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

دریچۂ کربلا

محمّد علی سیّد

محفوظ بُک ایجنسی امام بارگاہ شاہ نجف مارٹن روڈ کراچی

۲۴ سچی کہانیوں کا مجموعہ

تحریر

محمد علی سیّد

ترتیب و تزئین

اے ایچ رضوی

محفوظ بک ایجنسی ❀ مارٹن روڈ کراچی

Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882

E-mail: anisco@cyber.net.pk

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	دریچۂ کربلا
مصنف	:	محمد علی سیّد
پہلا ایڈیشن	:	ایک ہزار
سنِ اشاعت	:	مارچ ۲۰۰۸ء
سرِورق	:	رضا گرافکس 0333-3206541
کمپوزنگ	:	احمد گرافکس، کراچی
طباعت	:	ذکی سنز پرنٹرز
پبلشرز	:	محفوظ بک ایجنسی، مارٹن روڈ کراچی
قیمت	:	۲۰۰/=

کتاب کے بارے میں مشورے یا تبصرے کے لیے مصنف سے درج ذیل ای میل پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

ای میل: alisyed14@hotmail.com

ناشر

محفوظ بک ایجنسی — مارٹن روڈ کراچی

Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882

E-mail: anisco@cyber.net.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱) اشقیائے فرات	فیض الحسن موسوی انبالوی	دبستانِ انیس پنڈی
۲) چودہ ستارے	مولانا نجم الحسن کراروی	امامیہ کتب خانہ لاہور
۳) ریاض الاحزان	آقائے سیّد محمد حسن قزوینی	ولی العصر ٹرسٹ، جھنگ
۴) شہیدِ انسانیت	علامہ سیّد علی نقی مرحوم	امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور
۵) صحیفۂ کربلا	جناب علی نظری منفرد	دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

اس کتاب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُنھیں عالمِ اسلام کی درج ذیل شہرۂ آفاق کتابوں میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۱) روضۃ الشہداء	۲) بحار الانوار	۳) کبریت احمر
۴) صواعقِ محرقہ	۵) کشف الغمہ	۶) ناسخ التواریخ
۷) انوار المجالس	۸) خلاصۃ المصائب	۹) تاریخ کامل
۱۰) الدمعۃ الساکبہ	۱۱) نورالابصار	۱۲) مطالب السئول
۱۳) نور العین	۱۴) تاریخ ابو الفداء	۱۵) حیات الحیوان
۱۶) جلاء العیون	۱۷) طبری	۱۸) تاریخ اعثم کوفی
۱۹) مقتل عوالم	۲۰) ذکر العباسؑ	۲۱) تاریخ ابن الوردی
۲۲) وسائل مظفری	۲۳) ینابیع المودۃ	

شرفِ انتساب

دربار جناب مخدومۂ کائنات، حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا سے
حاصل ہونے والی اس توفیقِ ذکرِ حسینؑ.. یعنی کربلا والوں کے
حوالے سے اس تحریر کو
میں امام عالی مقامؑ کے بچپن کے دوست،
راز دار، جاں نثار، جناب حبیب ابنِ مظاہرؓ
کے توسط سے فرزندِ رسولؐ
کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔
اس التجا کے ساتھ وہ آقاؑ کے دربار میں
میری باریابی کا وسیلہ بن جائیں۔
جانتا ہوں کہ بچپن کے دوستوں کی
سفارش رد نہیں کی جاتی!
دنیا کے بادشاہ کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کے لئے
خزانوں کا منہ کھول دیتے ہیں۔ وہ حاجت مندوں کو ان
کے مقام کے مطابق نہیں، اپنے اعلیٰ مرتبے کے مطابق عطا کرتے ہیں۔
آقا سیّد الشہداؑ! جب آپؑ عطا فرمائیں تو شیطان کے پھندوں میں تڑپتے پھڑکتے
اس کم ترین غلام کے پست مقام کو نہ دیکھیئے گا۔
امام عالی مقامؑ کے دربارِ دُربار سے مجھے جو اجر و ثواب حاصل ہوگا
میں اس کے شکرانے کے ساتھ، اس اَجر و ثواب میں
میں اپنے والدین، بزرگوں اور تمام مومنین و مومنات کو برابر کا شریک
کرتا ہوں۔

محمد علی سیّد

اجازت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرِ گرامی! محترم عنایت صاحب
محفوظ بک ایجنسی، مارٹن روڈ، کراچی
السلام علیکم:۔

میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ میری کتابیں ''لہو کی موجیں'' اور '' دریچہ کربلا'' کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

میں اپنی دونوں کتابوں کے جملہ حقوق آپ کے ادارے کے نام کر رہا ہوں۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لیے آپ کے سوا کسی پبلشر کو شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مولانا کلب صادق صاحب قبلہ کی رائے

دین کو سمجھئے اور دین صرف سننے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ پڑھنے سوچنے غور و فکر کرنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ آپ کے اس شہر، آپ کے ملک میں ایک اچھا رائٹر موجود ہے جو لکھتا ہی صرف دین کے لئے ہے۔ اس کا نام ہے محمد علی سیّد۔ ان کی کتابیں پڑھئے۔

ثقلین اور سائنس، لہو کی موجیں، دعا رب العالمین اور انسان، جسم کے عجائبات۔ بہت اوریجنل لکھنے والا ہے یہ شخص۔ آپ ہی کے شہر میں رہتا ہے۔

محمد علی سیّد کی کتابیں پڑھئے، آپ دیکھیں گے کہ آپ کی معرفت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں سب دکانوں پر موجود ہیں۔

محفل شاہ خراسان۔ ۸ محرم الحرام کی مجلس سے خطاب

آیت اللہ علامہ عقیل الغروی صاحب قبلہ کا تبصرہ

محمد علی سیّد صاحب کی کتابیں، ان کی تحریریں پڑھتا ہوں تو خدا کی قسم ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ علم کو پھیلانا، باتوں کو آسان تر کر کے بیان کرنا ان کا مشن ہے۔ یہ مسلسل کام کر رہے ہیں۔ میں جب پاکستان آتا ہوں ان کی ایک دو نئی کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ لہو کی موجیں، جسم کے عجائبات واقعتاً ان کی معرکتہ الآرا تحریریں ہیں۔

لہو کی موجیں میں نے انڈیا جا کر پڑھی۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لیے اس قدر متاثر کن ہے کہ میں نے وہاں اس کی بہت سی فوٹو کاپیاں کرا کے اپنے جاننے والوں اور اپنے خاندان کے نوجوانوں میں تقسیم کیں۔ اس بات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں ان کی تحریروں اور ان کی خدمات کا کس قدر معترف ہوں۔

عرضِ ناشر

جناب محمد علی سیّد معروف ادیب، شاعر اور براڈ کاسٹر ہیں۔ ان کی تحریریں ملک کے مشہور و معروف دینی و ادبی جریدوں کی زینت بنتی رہی ہیں۔ آپ ماہنامہ ''معصوم'' اسلام آباد اور ماہنامہ ''طاہرہ'' کراچی کے بانی مدیر رہ چکے ہیں۔ ماہنامہ معصوم میں اُنہوں نے دس سال تک مسلسل لکھا۔ تاریخ کربلا اور قران اہلِ بیتؑ اور سائنس اِن کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اب تک ان کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں ''رب العالمین، دُعا اور انسان''۔ کربلا کے پس منظر میں معرکتہ الآراء تاریخی ناول ''لہو کی موجیں''۔ انسانی جسم کی کارکردگی کے حوالے سے ''جسم کے عجائبات'' اور قران، اہلِ بیتؑ اور سائنس کے موضوع پر ان کی تازہ تصنیف ''ثقلین اور سائنس'' شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب محمد علی سیّد صاحب کی پانچویں کتاب ہے اور یہ کربلا کے حوالے سے مستند اور سچی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا ظاہری حسن تو آپ پر ظاہر ہے لیکن محمد علی سیّد صاحب کی تحریروں کے حسن اور قدر و قیمت کا اندازہ آپ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہی لگا سکیں گے۔ جناب محمد علی سیّد مستند تاریخی حوالوں کے ساتھ انتہائی آسان زبان و اسلوب میں لکھتے ہیں۔ خود ساختہ کہانیاں لکھنا مشکل کام نہیں لیکن مستند تاریخی واقعات کو فکشن کے انداز میں لکھنا ایک خاص توفیق کا طلب گار تھا اور یہ توفیق محمد علی سید صاحب کو حاصل ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ مشکل سے مشکل موضوع کو اپنے قارئین کے لیے آسان سے آسان تر کرتے جاتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ محمد علی سیّد ایسے صاحبِ قلم ہیں جنھوں نے دینی صحافت میں نئے رجحانات، نئی زبان اور اسلوب کے ساتھ لکھنے کا آغاز کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے بہت سارے نئے لکھنے والوں اور مقررین کو اِس راہ پر گامزن کیا۔ اِس حقیقت کے آپ بھی گواہ ہیں کہ دینی ادب و صحافت میں ہماری زبان اور اسلوب کم و بیش ساٹھ ستّر سال

پہلے کسی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ یہ جمود سن دو ہزار کے بعد ٹوٹنا شروع ہوا ہے۔ آج جو آپ دینی اور تبلیغی تحریروں اور تقریروں میں نئی اور تازہ زبان پڑھ اور سن رہے ہیں اِس میں محمد علی سیّد کا کہیں نہ کہیں کوئی کردار ضرور ہے۔

یہ تمام کہانیاں جو اس کتاب میں شامل ہیں اُنھیں جناب محمد علی سیّد نے ماہنامہ ''معصوم'' اسلام آباد کے لیے 1997ء سے 2004ء کے درمیان لکھا۔ ہمارے ادارے نے بڑی کوششوں کے بعد اِن کہانیوں کو جمع کیا اور اب انھیں ماہنامہ معصوم کے شکریے اور معصومینؑ کی شکر گزاری کے ساتھ اپنے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ انھیں پڑھنے کے بعد آپ ہمارے حسنِ انتخاب کی داد ضرور دیں گے انشاء اللہ!

ہمارا ادارہ محمد علی سیّد صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب ''لہو کی موجیں'' شائع کر چکا ہے (اگر آپ نے یہ کتاب نہیں پڑھی تو ہماری درخواست ہے کہ اسے ضرور پڑھیے) اس کے علاوہ ادارہ بہت جلد جناب محمد علی سیّد کی دوسری کتابیں بھی شائع کر رہا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے لیے اور محمد علی سیّد صاحب کے لیے مغفرت و معافی، صحت و سلامتی اور کاموں میں کامیابی و برکت کے لیے ضرور دُعا فرمایئے گا۔

والسلام

اے۔ایچ رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

احوالِ واقعی

آج جانے کیوں آپ سب سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ بھی اس کتاب کے بارے میں کسی وقت مجھے اپنے تاثرات سے آگاہ فرمائیں گے۔ میرا ای میل اور فون نمبر اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر موجود ہیں۔

جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ کربلا اور کربلا والوں کے حوالے سے ۲۴ سچی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام کہانیاں بچوں کے مشہور جریدے ماہنامہ معصوم اسلام آباد میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب انھیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ میرے ٹارگٹ ریڈرز میٹرک کی کلاس اور عمر کے بچے ہوتے ہیں۔ میں ان بچوں کے لیے لکھتا ہوں تو یقین ہوتا ہے اس عمر سے زیادہ تمام عمروں کے قارئین میری تحریروں کو نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ پڑھ اور سمجھ پائیں گے۔

آپ جانتے ہیں کہ اب سے پندرہ بیس سال پہلے ہماری مجالس کا موضوع تاریخِ کربلا، واقعہ کربلا ہوا کرتا تھا۔ آج صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ آج بیشتر مجالس میں قرآن ہے، تفسیر ہے، حالاتِ حاضرہ ہیں، سیاست ہے، علمِ کلام ہے منطق و فلسفہ ہے، مختلف نظریات ہیں۔

کربلا اور کربلا والوں کا تذکرہ مجلس میں حصولِ اشک کے لیے کیا جاتا ہے۔ کربلا کے واقعات مجلس کے آخری حصے میں چند منٹوں کے لیے بیان کیے جاتے ہیں۔ کربلا کو بیشتر صورتوں میں رُلانے کے لیے بیان کیا جاتا ہے اگرچہ اس کا تذکرہ قوم کو جگانے کے لیے بھی ہونا چاہیے تھا!

نئی نسل کے نوجوان کربلا کے حوالے سے علی اکبرؑ اور برچھی، عباسؑ اور مشکِ سکینہؑ، علی اصغرؑ اور تیر، زینبؑ اور چادر کو تو جانتے ہیں اور ان کا نام سن کر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہیں۔ لیکن علی اکبرؑ، عباسؑ، سکینہؑ، زینبؑ کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں۔ یہ عظیم لوگ کون تھے، ان کا کردار کیا تھا، ان کی خدمات کیا تھیں، ان کی قربانیاں کیا تھیں، ان کے اقدامات کیا تھے، ان کی شخصیت کیا تھی، اس کے بارے میں بتانے کی نہ اب ذاکرین کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں، نہ سامعین کو اس کی کوئی جستجو ہے۔ ذاکرین نے تصور

کرلیا ہے کہ سامعین کو پہلے ہی سب کچھ معلوم ہے اور سامعین کا خیال ہے کہ مآلِ مجلس آنسو ہیں۔ آنسو جو ہماری آنکھوں میں خود بہ خود بھی آجاتے ہیں کہ یہ کربلا کا اپنا معجزہ ہے۔

1996ء میں جب میں نے معصوم کے لیے لکھنا شروع کیا تو میرا بھی وہی خیال تھا جو مجلس کے عام سامعین کا ہوتا ہے کہ مجھے کربلا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے لیکن جب لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ مجھے واقعہ کربلا کی ''شہ سرخیوں'' کے سوا کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

اپنے جہل کو دور کرنے کے لیے جب اس موضوع پر پڑھنا شروع کیا تو مولا علی علیہ السلام کا ایک قول یاد آ گیا۔ آپؑ نے فرمایا: علم تین بالشت ہے۔ جو پہلی بالشت تک پہنچا وہ مغرور ہو گیا، اس نے تکبر اختیار کیا۔ جو دوسری بالشت تک پہنچا وہ جھک گیا، اس نے انکساری اختیار کی اور جو تیسری بالشت تک پہنچا تو اُسے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اُسے کچھ معلوم نہیں وہ بالکل جاہل ہے۔

واقعہ کربلا محض ایک تاریخی واقعہ نہیں۔ واقعہ کربلا اللہ کی عظیم نشانی، معرفتِ خدا، رسولؐ اور اہل بیتؑ کا عظیم خزانہ اور تحفظِ اسلام کی ایک عظیم درس گاہ ہے لیکن واقعہ کربلا کے حوالے سے ہماری معلومات کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ مولا علی علیہ السلام نے علم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

میں نے جب کربلا کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا تو اپنے تمام تر ''مجلسی علم'' کے باوجود معلوم ہوا کہ ابھی تو علم کی پہلی بالشت بھی بہت دور کی بات ہے کہ آدمی کسی قدر تکبر محسوس کر سکے۔

اپنے اس جہل سے مجھے اندازہ ہوا کہ نئی نسل کے نوجوان بچے بچیاں جو بڑے خلوص و عقیدت کے ساتھ مجالس میں شرکت کرتے ہیں وہ کربلا کے بارے میں کس قدر جانتے ہوں گے!

اس کے بعد جب میں نے اس موضوع پر پڑھنا شروع کیا تو مجھ پر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ ہماری دینی کتابوں میں جو زبان، اور اندازِ بیان اختیار کیا جاتا ہے وہ کم از کم پچاس ساٹھ سال پرانا ہے۔ زبان تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اندازِ بیان بھی وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ زبان کو آپ پھولوں سے لدی پھندی کسی بیل سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پھولوں کی بیلیں بڑھنے لگتی ہیں تو ان کا نچلا سرا پتوں اور پھولوں

سے خالی ہوتا رہتا ہے اور دیوار یا چھت پر چڑھنے والا آخری سرا، تازہ پتوں، پھولوں اور کلیوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہی معاملہ زبانوں کا بھی ہے۔ آج ہماری زبان ہرگز وہ نہیں جو آج سے پچاس سال پہلے لکھی، بولی اور سمجھی جارہی تھی۔ پہلے اس علاقے کے فاتحین کی زبان عربی یا فارسی ہوا کرتی تھی تو عربی اور فارسی کے الفاظ، محاورے اور ڈکشن ہماری زبان کا حسن تھے۔ آج ہمارے فاتحین کی زبان انگریزی ہے تو آج اُردو زبان میں انگریزی کے بے شمار الفاظ نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ آج کی نئی نسل عربی فارسی کے الفاظ کو نہیں سمجھتی، انگریزی کے الفاظ آج بہت کم علم رکھنے والے آدمی کی بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ (یہ ایک المیہ ضرور ہے لیکن بہر حال حقیقت ہے)

میری بیٹی اسکول سے آئی تو اس نے آتے ہی اپنی ماں سے کہا۔ "اماں! فاطمہ نے آورز لیے تھے، کسی نے ہیک کرلیے۔" وہ انٹرنیٹ کے گھنٹوں کی بات کررہی تھی۔ اس جملے کا مطلب ہم تو سمجھ گئے لیکن ہماری ایک عزیزہ حیران رہ گئیں کہ آخر یہ کیا کہہ رہی ہے۔ یہ معاملہ ہے کمیونی کیشن گیپ کا۔ آج کے مبلغین، مقررین، ذاکرین، مصنفین اور ان کے ٹارگٹ ریڈر، ٹارگٹ لسنرز یعنی قارئین وسامعین کے درمیان یہ مسئلہ بہت گھمبیر شکل اختیار کرگیا ہے۔

ملک سے دور رہنے والے مسلمان گھرانوں میں یہ مسئلہ کسی اور طرح بھی مشکل پیدا کررہا ہے۔ جو خاندان پچیس تیس سال پہلے یورپ امریکا وغیرہ میں جابسے تھے وہ اپنے گھر میں اُردو زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن خود ان کی اپنی اُردو فریز (Freez) ہوچکی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں آج جو زبان لکھی پڑھی اور بولی جارہی ہے وہ پچیس سال پہلے لکھی، بولی اور سمجھی جانے والی اُردو سے بہت حد تک مختلف ہے۔ لندن، امریکا، کینیڈا میں مجالس سے خطاب کرنے والے علماء ذاکرین ہندوستان پاکستان ہی سے تشریف لے جاتے ہیں اور یہاں کے کامیاب عشروں کے موضوعات کو وہاں کے سامعین کے لیے بیشتر صورتوں میں جوں کا توں بیان کردیتے ہیں۔ (استثناء کی گنجائش اپنی جگہ ہے)۔ یورپ امریکا، کینیڈا کے مومنین اپنی نئی نسل کو اپنے دین و مذہب کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔ وہ نئی نسل کو امام بارگاہوں میں لے جاتے ہیں لیکن اکثر صورتوں میں نئی نسل ان مجالس سے اس طرح استفادہ نہیں کرپاتی جیسا کہ کیا جانا چاہیے تھا۔

۲۴ سچی کہانیوں پر مشتمل یہ کتاب دنیا بھر میں موجود عزاداران امامِ عالی مقامؑ کی اس نئی نسل کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ جب بچے اور نوجوان مجالس میں کربلا کے شہیدوں کا تذکرہ سنیں تو یہ جان بھی سکیں کہ یہ عظیم انسان کون تھے، ان کے کیا جذبے تھے اور کیا قربانیاں اُنہوں نے اللہ کی راہ میں پیش کیں۔

میرا ارادہ تھا کہ کربلا کے تمام شہیدوں کے حوالے سے الگ الگ کہانیاں لکھوں۔ اس ارادے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا ہوں کہ اس کتاب میں آپ امام عالی مقامؑ کے ساتھ ساتھ حضرت ابوالفضل عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، حضرت علی اصغرؑ، جناب زہیر قینؓ، جناب حر ابنِ یزید ریاحیؒ، جناب قاسم ابنِ حسنؑ، بی بی سکینہؑ اور بی بی زینب بنت علی صلوٰات اللہ علیہا کے حوالے سے کہانیاں پڑھیں گے۔ دُعا فرمایئے گا کہ میں کربلا کے باقی تمام شہیدوں کے حوالے سے بھی کہانیاں لکھ سکوں۔

اِس کتاب کی آخری کہانیوں میں آپ کو واقعات کی ایک خاص ترتیب نظر آئے گی۔ یہ اس لیے کہ میں اپنے ناول ''لہو کی موجیں'' کی طرح واقعاتِ کربلا پر ایک دوسرا ناول تحریر کرنا چاہتا تھا۔ خواہش تھی کہ جو واقعات ''لہو کی موجیں'' میں سرسری انداز سے بیان کیے تھے اُنھیں دوسرے ناول میں تفصیل سے لکھ سکوں۔ بہر حال ایسا نہ ہوسکا۔ اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو یقیناً یہ خواب بھی ضرور پورا ہوگا۔

میں نے کئی کہانیوں میں میر انیسؔ کے مرثیوں سے کئی بند استعمال کیے ہیں۔ تاکہ ہماری نئی نسل دیارِ ہند میں کربلا کے اِس عظیم مصور و مبلغ کی جانب بھی متوجہ ہوسکے۔ میر انیسؔ کے کلام نے میری ان تحریروں کی اثر انگیزی میں یقیناً اضافہ کیا ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ ان کہانیوں کو پڑھیے اور اگر ممکن ہو تو ای میل کے ذریعے مجھے اپنی آراء سے مطلع بھی فرمایئے۔

والسلام

محمد علی سیّد

ای میل: alisyed14@hotmail.com

قارئین سے درخواست

میں نے خیر پور میرس کے محلے پھر گڑی میں ہوش سنبھالا۔ ذکرِ حسینؑ اور غمِ حسینؑ کے انمول خزانے مجھے خیر پور میرس میں اپنے گھر کی مجالس اور خیر پور ہی کے فرشِ عزا سے حاصل ہوئے۔ اس وقت جب کربلا کے حوالے سے یہ کتاب شائع ہونے جارہی ہے تو مجھے اپنے مرحوم والدین، عزیز رشتے دار، دوست مہربان اور خیر پور میں عزاداری برپا کرنے والے بزرگ یاد آرہے ہیں کہ انھی کے ذریعے غمِ حسینؑ کی دولت مجھ تک منتقل ہوئی۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے دوران جب آپ کو اپنے رُخساروں پر آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو تو میرے مرحوم والدین، عزیز رشتے داروں، دوستوں اور خیر پور کے مرحومین اور ان عزاداروں کو اپنی دُعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

سیّد علی اسد نقوی، سیّدہ فاطمہ بانو، سیّد محمد خلیل رضوی، انوار بانو (ابجیا) بنت حامد علی، سہیل ابنِ منظر کاظمی، نشاط انجم زیدی، سیّد تعظیم حسین نقوی، نفیس فاطمہ، رئیسہ بیگم، مختار آغا، سیّد محمد رضا، شاکر حسین، کنیز فاطمہ، ناصر عباس، محمد علی موتی بابو، بخشش حسین، مشرف حسین، میر محمد خان تالپور، فیض محمد پنہور، سرائی گھنور خان، سرائی الطاف حسین، عبدالحسین جعفری، احمد حسین، ابنِ علی، مولا بخش، مولانا شبیہ الحسن محمدی، سیّد ساجد، پروین، سیّد محمد سالم، ایس ایم سلیم، زینت جہاں، اقبال جہاں، حسنہ جہاں، حاکم زیدی، زوار حسین، طیبہ خانم، اقبال میاں زیدی، سیّد حسن میاں زیدی، سرداری بیگم، نور الصباح، عسکری میاں، بنّے میاں، حکیم محمد میاں زیدی، سیّد ظہور حیدر، مبارک حسین، علی حسین، لیاقت حسین، نوشاہی بیگم، مصباح المجتبیٰ، عشرت حسین، انتخاب حسین، محمد عباس، افضال مہدی، سیّد ناصر جہاں، سیّد باقر رضا، زاہدہ خاتون، عابدہ خاتون، سیّد علی اطہر، علی اصغر، علی باقر، زائر حسین، سیّد علی مظاہر جعفری، مظاہرہ خاتون، وکیل، سیّد افتخار حسین رضوی، عزیز فاطمہ، غلام حسین، محمد حسنین کاظمی، اقتدار حسین رضوی، وصی حیدر رضوی، ڈاکٹر بابر، حکیم مسلم حسین، سیّد مقصود علی (ڈاکٹر نقوی)، ناطق بدایونی، مسلمہ خاتون، مولانا امتیاز حسین، حکیم وجیہہ الحسنین، یوسف حسین (وکیل)، ڈاکٹر رضوی۔

فہرست

حسنؑ کا چراغ

۶۴
بعد میں جناب قاسمؑ کو معلوم ہوا کہ وہ حجرہ جس میں رسول خداؐ آسودہ خواب ہیں بی بی عائشہؓ کو رسول اللہؐ کی وراثت میں ملا تھا۔ وہی وراثت جسے جب جناب فاطمہ زہراؑ نے حاصل کرنا چاہا تو حکمرانوں نے کہا تھا کہ انبیاؑ اپنی وراثت نہیں چھوڑا کرتے۔

بے تیغ سپاہی

۷۳
ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن ان کے آنسو کسی چوپائے کی آنکھوں سے بہنے والے پانی سے بھی زیادہ حقیر تھے کیونکہ وہ روتو رہے تھے مگر آگے بڑھ کر امام وقتؑ کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھے۔

قبروں کی جگہ

۸۰
اب کربلا میں آنے والی یزیدی فوج کی حیثیت ایک جارح اور حملہ آور فوج کی تھی جو حسینؑ ابن علیؑ کی ذاتی جاگیر میں گھس کر سرکاری دہشت گردی کی مرتکب ہونیوالی تھی۔

رَے کی حکومت

۹۱
ابنِ زیاد مسلمانوں کی شخصیت پرستی سے بھی واقف تھا اور ظالم اور جابر حکومت کی ضرورت سے بھی جسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور دین اسلام کو مسخ کرنے کے لئے عمر ابنِ سعد جیسے نام نہاد علماء کی تلاش رہتی تھی۔

روشنی کی طرف

۱۰۳ اس بار حج کے دنوں میں انہوں نے مکے کے اندر کچھ غیر معمولی چہل پہل دیکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس مرتبہ شام کے علاقے سے زیادہ حاجی حج کرنے آئے ہیں۔ مکے کے اندر بھی اس مرتبہ حفاظتی انتظامات پہلے کی نسبت زیادہ نظر آ رہے تھے۔

جنگ سے پہلے ہار

۱۱۳ حر کا ایک بازو حضرت عباسؑ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرا بازو حضرت علی اکبرؑ نے پکڑ رکھا تھا اور یزیدی لشکر کے ہزار سپاہیوں کا سردار مجرموں کی طرح ہاتھ باندھے امام حسین علیہ السلام کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

قدموں کی خاک

۱۳۰ یہ سننا تھا کہ نافع بن ہلالؓ کے خون کی گردش بڑھ گئی۔ ان کا پورا بدن لرزنے لگا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزادی زینبؑ کو کس طرح اپنی اور دوسرے اصحابِ حسینؑ کی وفاداری کا یقین دلائیں۔

منزل آ گئی

۱۳۷ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ سارا میدان گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس قدر مٹی اڑ رہی تھی کہ سورج کی دھوپ مدہم ہوگئی تھی۔ دھوپ ہلکی ہونے کے باوجود فضا میں ایسا حبس تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

وَامحمدا......وَامصیبتا

۱۴۷

یہ ایک بے گور وکفن لاش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس لاش کو گھوڑوں کے سُموں تلے روندا گیا ہے۔ سارا جسم شکستہ تھا اور قریبی زمین جسم سے مسلسل بہنے والے خون سے لال ہو رہی تھی۔

وہ ہم ہی ہیں

۱۵۲

وہ خاصا مذہبی آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے امام زین العابدینؑ کے قریب آکر کہا "اس اللہ کی حمد ہے جس نے امیر المومنین یزید کو فتح عطا فرمائی اور تمہارے بزرگوں کو قتل کیا"۔ اس کے چہرے کی خوشی قابلِ دید تھی۔

بت شکن کی بیٹی

۱۵۶

سورہ آلِ عمران کی اس آیت نے یزید کے پھیلائے ہوئے اس پروپیگنڈے کے پرخچے اڑا دیئے کہ اس کی کامیابی اور حکومت واقتدار اللہ کے نزدیک اس کے عزت کی وجہ سے ہے۔ وہ لوگ اپنے ہر جرم کو اللہ کی طرف منسوب کرنے کے عادی تھے۔

زندان کی روشنی

۱۶۴

زمانے کے عظیم انقلاب، مصیبتوں کے لمبے دن، بازاروں میں بے پردگی کے دکھ اور درباروں میں قیدیوں کی طرح کھڑے رہنے کی ذلتیں ان کے عزم واستقلال کو شکست نہیں دے سکی تھیں۔

سفرِ شہادت

کفر وشرک کے نئے دور کے بتوں کو پاش پاش کرنے کے لیے نئے ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ان جیتے جاگتے طاقت ور بتوں کو تلواروں سے نہیں اپنے خون کی دھاروں ہی سے پاش پاش کیا جاسکتا تھا۔ ۱۷۳

یزیدی سازش

سنتِ ابراہیمیؑ پر عمل کرنا آسان تھا لیکن جذبۂ ابراہیمیؑ پر عمل کرنا بہت مشکل کام تھا کہ اس میں چوپایوں کی نہیں خود اپنی اور اپنی آنکھ کے تاروں اور دل کے سہاروں کی قربانی پیش کرنا پڑتی ہے۔ ۱۸۶

ابراہیمِ کربلاؑ

کبھی رات کے پچھلے پہر آسمان سے سفید روشنی کی جھالریں سی زمین پر آ کر بچھنے لگتیں اور سارا میدان ایسی خوشبوؤں سے مہکنے لگتا کہ ایسی خوشبوئیں قبیلے والوں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھیں۔ ۱۹۴

خطیبِ کربلاؑ

جیسے ہی سورج کا سرخ تھال صحرائی ٹیلوں کے عقب سے اوپر اٹھا، صبح کی ٹھنڈی ہوا دھیرے دھیرے صحرائی لُو کے گرم جھونکوں میں تبدیل ہونے لگی اور دشت نینوا کے نشیب و فراز تندور کی طرح دہکنے لگے۔ ۲۰۲

مظلوم کربلاؑ

بدر و احد کے بدلے چکائے جا چکے تھے۔ نواسۂ رسولؐ کو ذبح کر دیا گیا تھا اور اب شیطان کے وفادار آگ کی مشعلیں تھامے اللہ کے آخری رسول محمد مصطفیٰؐ کے گھر کو آگ لگانے خیمۂ اہل بیتؑ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ۲۱۲

سجدۂ آخر

آپؑ نے بے اختیار آہ کی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: "اے پالنے والے! تو جانتا ہے کہ یہ بدبخت کسے قتل کر رہے ہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ پوری دنیا میں میرے علاوہ کوئی فرزند رسولؐ نہیں۔" ۲۲۳

سرخ آندھی

انتقام خون حسینؑ کی سرخ آندھی نے کوفے میں حرکت کرنا شروع کی تھی اور اس نے بہت جلد کوفے کی ظالم حکومت کا خاتمہ کر کے دارالامارہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سرخ آندھی کا نام تھا مختار ثقفی۔ ۲۳۹

قاتل کا انجام

انتقام خون حسینؑ کی یہ سرخ آندھی جس قدر تیزی سے اٹھی اسی قدر تیزی سے ختم بھی ہوگئی لیکن ختم ہونے سے پہلے اس کے طاقت ور بگولوں نے قاتلان امام حسینؑ میں سے ایک ایک کو چن چن کر اٹھایا اور انہیں جہنم کے شعلوں میں لے جا کر پھینک دیا۔ ۲۴۵

پانچواں ستارہ

نبی کریمؐ ان کا خواب سن کر ایک لمحے کو خاموش ہوگئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کی بات سن رہے ہوں۔ حضرت جبرائیلؑ جب بھی اللّٰہ کا پیغام لے کر آتے تھے نبی کریمؐ اسی طرح خاموش ہوجایا کرتے تھے۔

—*****—

انہوں نے وہ خواب رات کے آخری پہر دیکھا تھا۔ عجیب وحشت ناک خواب تھا۔ ان کا پورا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا اور دل کی دھڑکن بے قابو ہوئے جارہی تھی۔ سوتے سوتے اٹھ کر انہوں نے پانی پیا تو حالت ذرا سنبھلی۔ اب نامعلوم اندیشوں نے ان پر خوف سا طاری کردیا تھا۔ خواب ایسا تھا کہ حقیقت معلوم ہوتا تھا کہ لیکن ام الفضلؓ اس حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی کے جسم کا ٹکڑا کاٹ کر ان کی گود میں ڈال دیا جائے۔

انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ اللہ کے رسولؐ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک کا ایک ٹکڑا کاٹ کر ان کی گود میں رکھ دیا گیا ہے۔ ام الفضلؓ کا دل کسی انجانے خوف سے ابھی تک لرز رہا تھا۔ گھوم پھر کر ان کا دھیان اللہ کے رسولؐ ہی کی طرف جاتا تھا کہ ان کی جان کے دشمن بے شمار تھے۔ کفار، مشرکین اور منافقین سبھی رسول اللہؐ کے خون کے پیاسے تھے۔

مسجدِ نبوی سے اذانِ فجر کی آواز بلند ہوئی تو ام الفضلؓ اپنے خیالوں سے چونکیں اور نماز کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ ان کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ وہ جلد از جلد رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی تھیں کہ ان سے اپنا خواب بیان کریں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہوتے صبح کا ملگجا اندھیرا رخصت ہونے لگا تھا۔ ام الفضلؓ نے چادر اوڑھی اور مسجد نبوی جانے کے لئے گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر اور عشاء کی نماز کے بعد مختصر سا درس دیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ صحابہ کرامؓ کے درمیان بیٹھے تھے اوران سے محو گفتگو تھے۔ ام الفضلؓ بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئیں۔ ان کی نظریں نبی کریمؐ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اللہ کے رسولؐ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ام الفضلؓ جلدی سے ان کے قریب پہنچیں۔ ''یا رسول اللہؐ! آج میں نے ایسا خواب دیکھا ہے کہ....'' ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اللہ رحمان و رحیم ہے۔ وہ کرم کرے گا ان شاء اللہ۔ تم خواب بیان کرو''۔ نبی اکرمؐ کے لہجے میں بے پناہ شفقت تھی۔

نبی کریمؐ غریب طبقے کے لوگوں، کنیزوں اور غلاموں سے انتہائی عزت سے بات کرتے تھے کہ وہ لوگ کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ نبی کریمؐ کے اس محبت آمیز برتاؤ کو دیکھ کر ام الفضلؓ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ''آقا میں نے خواب دیکھا کہ....'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

''ہاں ہاں بتاؤ تم نے خواب میں کیا دیکھا'' نبی کریمؐ نے شفقت سے کہا۔

''میں نے دیکھا... کہ.... آپؐ کے جسم مبارک کا ٹکڑا.... کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا گیا ہے۔'' ام الفضلؓ نے بہ مشکل اپنی بات مکمل کی۔ ان کا دل بری طرح لرز رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو امنڈے پڑ رہے تھے۔

نبی کریمؐ ان کا خواب سن کر ایک لمحے کو خاموش ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کی بات سن رہے ہوں۔ حضرت جبرائیلؑ جب بھی اللہ کا پیغام لے کر آتے تھے نبی

کریمؐ اسی طرح خاموش ہوجایا کرتے تھے۔ پھر اگلے ہی لمحے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ ایسا لگا جیسے انہیں کوئی بہت بڑی خوشخبری سننے کو ملی ہو۔

''ام الفضلؓ! تمہارا خواب بہت مبارک ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ میری بیٹی فاطمہؑ کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوگا جس کی پرورش تم کروگی۔'' اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امِ الفضلؓ سے فرمایا۔

خواب کی تعبیر سن کر ام الفضلؓ کا چہرہ کھل اٹھا۔ انہوں نے اپنے آنسو چادر کے پلّو سے پونچھے اور ایک طرف کو ہوگئیں۔ نبی کریمؐ باوقار انداز سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے حجرے کی طرف بڑھنے لگے۔

ام الفضلؓ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ایسے کام کے لیے منتخب کیا جس کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ جناب فاطمہؑ کا گھر تو وہ گھر تھا جہاں فرشتے آیا کرتے تھے۔ جناب فاطمہؑ چکی پیسنے میں مصروف ہوتیں تو ان کے بیٹے حسنؑ کا جھولا خود بخود ہلنے لگتا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت جھولا جھلا رہی ہو کہ بچہ اٹھ نہ جائے۔ مدینے کی بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو حضرت فاطمہؑ کے گھر آتی رہتی تھیں۔ یہ پراسرار واقعات انہوں نے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کئی عورتوں نے فاطمہؑ کے گھر میں فرشتوں کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

ام الفضلؓ کے خواب کی تعبیر ہجرت کے چار سال بعد پوری ہوئی۔ تین شعبان کو آسمان ہدایت پر سلسلۂ ہدایت کا پانچواں ستارہ طلوع ہوا، یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔

مدینہ منورہ میں حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت علی علیہ السلام کے گھر اس دن عید کا سا سماں تھا۔ فجر کے وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرے بیٹے کی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے۔ ام الفضلؓ نے بچے کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر نانا جان کی گود میں دے دیا۔ نومولود بچہ بے حد حسین تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی نور

امامت سے چمک رہی تھی۔ نانا جان نے بچے کی پیشانی کو چوما۔ پھر اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور اسے سینے سے لگا کر ایک لمحے کو خاموش ہوگئے۔ پھر آپ نے بچے کے لیے دعا فرمائی اور کہا۔ ''اس بچے کا نام حسینؑ ہوگا۔ یہ نام اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ یہ مبارک نام سب سے پہلے علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے کا رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس نام کا کوئی انسان دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔''

حضرت علی علیہ السلام کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے بچے کو ماں کی گود میں دے دیا اور قریب بیٹھ گئے۔ ''فاطمہ! تمہارے یہ دونوں بیٹے میرے بیٹے ہیں۔'' آپ نے حسنؑ اور حسینؑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ام الفضلؓ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر پھر خاموش ہوگئیں۔ انہوں نے رسول خداؐ کے چہرے پر وہ کیفیت دیکھی تھی جو اللہ کا پیغام آنے کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ ام الفضلؓ نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کے چہرے پر آئی ہوئی خوشی کے تاثرات مدھم پڑتے جارہے تھے۔ آپؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی جارہی تھیں۔

اپنے بابا جانؐ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت فاطمہ زہراؑ بے تاب ہوگئیں۔ وہ تو اپنے باباؐ کی ذراسی تکلیف برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔

نبی کریم کو اب تک بے شمار اذیتیں برداشت کرنا پڑی تھیں مگر کبھی کسی نے ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ ہاں جب وہ عبادت میں مصروف ہوتے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو امنڈتے رہتے تھے۔

''بابا جان.... بابا جان! بابا جان! کیا مجھ سے یا علیؑ سے کوئی گستاخی ہوگئی؟! حضرت فاطمہ زہراؑ نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں بیٹی! نہیں۔'' نبی کریمؐ نے اپنی لاڈلی بیٹی کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ آپ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''بیٹی! ابھی جبرائیل آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میرا یہ بیٹا اللہ کی

راہ میں ایسی بے مثال قربانی پیش کرے گا کہ اللہ کا دین ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ میرے اس بیٹے کی قربانی کی وجہ سے قیامت تک پیدا ہونے والے کروڑوں انسان جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جائیں گے۔'' نبی کریمؐ نے نوزائیدہ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آپ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''بابا جانؐ! یہ بات تو ہم سب کی سربلندی اور خوشی کی ہے۔ پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو.....!'' حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا۔

''ہاں بیٹا!... دین اسلام حسینؑ ہی کی قربانی سے سربلند ہوگا انشاء اللہ مگر....''

''مگر کیا باباؐ.... مجھے بتایئے، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' حضرت فاطمہ زہراؑ نے بے تابی سے پوچھا۔

''بیٹی! جبرائیلؑ نے بتایا ہے کہ حسین ایک دن ایک صحرا میں تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا جائے گا۔ اس سے پہلے اس کے عزیز و اقارب، دوست اور وفادار صحابی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کرکے شہید کیے جائیں گے۔ اس کے خیموں میں آگ لگا دی جائے گی، یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے سروں سے چادریں چھین لی جائیں گی اور خاندان رسالت کی عورتوں کو قیدی بنا کر سارے ملک میں گھمایا جائے گا....'' نبی کریمؐ کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

یہ سن کر حضرت فاطمہ زہراؑ بے اختیار رونے لگیں۔ ''بابا! کیا اس زمانے میں مسلمان دنیا میں نہیں ہوں گے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ان کا خیال تھا کہ لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں رسولؐ کے نواسے کو کون قتل کر سکے گا۔''

''اس زمانے میں مسلمانوں کی تعداد آج سے کہیں زیادہ ہوگی لیکن ان میں زیادہ تر نام کے مسلمان ہوں گے۔ میرے بیٹے حسین، اس کی اولاد اور اصحاب کو کوئی دوسری قوم نہیں خود مسلمان ہی شدید ظلم کے ساتھ شہید کریں گے۔'' رسول کریمؐ نے افسوس بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''میرے حسین کا جرم کیا ہوگا؟'' جناب زہراؑ نے سوال کیا۔

''اللہ کے دین کی حفاظت....'' نبی اکرمؐ نے فرمایا۔
''یہ کب ہوگا بابا جان؟'' جناب زہراؑ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''بیٹی یہ اس وقت ہوگا جب نہ میں دنیا میں ہوں گا، نہ علی، نہ تم، نہ حسن۔ حسین تنہا یہ سارے ظلم برداشت کرے گا۔'' نبی اکرمؐ کے آنسو ان کی ریش مبارک کو تر کر رہے تھے۔
''جب ہم میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا باباؐ تو میرے بیٹے پر روئے گا کون۔ اس پر گزرنے والے مصائب پر تو رونے والا بھی کوئی نہیں ہوگا!'' حضرت زہراؑ زور زور سے رونے لگیں۔
''میری جان فاطمہؑ! اس طرح نہ روؤ۔ میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر دور میں کچھ لوگوں کو پیدا کرتا رہے گا۔ جن کے بوڑھے، حسینؑ کے ساتھی بوڑھوں پر، ان کی عورتیں، عورتوں پر، جوان، جوانوں پر اور بچے، بچوں پر ہونے والے مظالم کو قیامت تک محسوس کر کے آنسو بہاتے رہیں گے۔'' نبی اکرمؐ نے بتایا۔

☆☆☆

دوستو! کہانی تو ختم ہوگئی۔ مجھے آپ سب کی آنکھوں میں آنسو نظر آ رہے ہیں۔ آنسوؤں کی یہ نعمت انسان کے علاوہ شاید ہی کسی دوسری مخلوق کو عطا کی گئی ہو۔ آپ کی آنکھوں کے آنسو جناب زہراؑ کے سوال کا جواب ہیں۔ یہ آنسو رسول اکرمؐ کی دعا کا نتیجہ ہیں۔ یہ آنسو حضرت امام حسینؑ سے محبت کرنے والوں کے لیے اللہ کا وعدہ ہیں۔ ان آنسوؤں کی قدر کیجئے۔ امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت جب بھی یاد آئے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئیں تو دل میں امام حسین علیہ السلام سے مخاطب ہو کہ کہا کریں کہ یا امام حسینؑ ! کاش کربلا میں ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے اور دین کے دشمنوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان آپ کے قدموں میں قربان کر دیتے۔

دین کی سربلندی کے لیے دنیا کی سپر طاقتوں سے مردانہ وار جنگ کرنے والے ہمارے آقاؑ! ہمیں وہ حوصلہ و طاقت عطا کیجیے کہ ہم آپ کی مظلومیت پر صرف آنسو ہی نہ بہائیں بلکہ آپ کے صبر و تقویٰ آپ کی عبادت و ریاضت اور آپ کی جرأت و بہادری جیسی صفات ہم میں بھی پیدا ہو جائیں تاکہ آج برپا ہونے والی کربلا میں ہم خاموش تماشائی نہ بنے رہیں، بلکہ آپ کی اور آپ کے باوفا ساتھیوں کی طرح ہم بھی ظالم حکمرانوں کے خلاف کلمۂ حق بلند کر سکیں۔ خواہ اس میں ہم اپنے خون میں نہا جائیں آپ کی طرح یا سید الشہداؑ۔

امامت کی ڈھال

اپنے پیارے باپ کے اس سفاکانہ قتل سے زینبؑ ایک بار پھر گھرے دکھوں میں گھر گئیں۔ نانا جانؐ کی یاد میں اپنی ماں فاطمہ زہراؑ کا مہینوں بے قرار ہو کر تڑپنا اب زینبؑ کی سمجھ میں آیا!

—*****—

یہ بچی جس کا نام زینبؑ رکھا گیا۔ سن چھ ہجری میں پانچ جمادی الاوّل کو مدینے میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ دو بیٹوں کے بعد اس بیٹی کے پیدا ہونے سے ماں باپ کے دل کھل اٹھے تھے۔ گھر کی رونق تو لڑکیوں ہی کے دم سے ہوتی ہے۔ ماں باپ نے تو دعائیں کر کر کے یہ بچی اپنے پالنے والے سے مانگی تھی۔ اس لئے اس بچی کی پیدائش پر ماں باپ جس قدر بھی خوش ہوتے وہ کم تھا۔ اس بچی کی ولادت کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی۔ اللہ کے رسولؐ فوراً ہی اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کے گھر آئے۔ جناب زہراؑ اپنی نومولود بیٹی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں اور بار بار اسے پیار کیے جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے باپ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو بچی کو گود میں لیے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''مبارک ہو تم دونوں کو۔ بیٹے اللہ کی نعمت ہوتے ہیں اور بیٹیاں اس کی رحمت۔ یہ بچی تو اللہ کی رحمت بن کر تمہارے گھر میں آئی ہے۔'' اللہ کے رسولؐ اپنی بیٹی اور داماد کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ اُنہوں نے اپنی بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ

رکھا۔ ’’لاؤ بیٹی! اس بچی کو میری گود میں دے دو۔‘‘

جناب زہراؑ نے اپنی لاڈلی بچی کو اس کے ناناؐ کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اللہ کے رسولؐ نے پہلے اس پھول سی بچی کو اپنے سینے سے چمٹایا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور اپنے رخسار مبارک اس بچی کے رخسار پر رکھ دیے۔ پھر جناب زہراؑ نے دیکھا، اللہ کے رسولؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں اور آپ اپنی نواسی کو پیار کرتے کرتے ہچکیوں سے رونے لگے۔

فاطمہ زہراؑ کے باپؐ کوئی عام انسان نہیں تھے۔ آپ تمام رسولوںؑ کے سردار، انبیاء کے سالار، اللہ کے سب سے پیارے بندے اور تمام مخلوقات سے عظیم تر انسان تھے۔ اللہ نے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام زمانوں اور ان کے ایک ایک لمحے کا علم آپؐ کو عطا کیا تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ دین اسلام کو قیامت تک زندہ رکھنے کے لئے ان کے سارے خاندان کو دکھوں کے سمندر، آگ کے دریاؤں اور اپنے لہو کی موجوں کے درمیان سے گزرنا ہوگا۔ آپؐ کو دوسرے نبیوںؑ اور رسولوںؑ سے کہیں بڑھ کر صبر و برداشت کے امتحانوں سے گزرنا تھا۔ ایسے وقت میں جب اسلام کے دشمن حق و باطل کی ملاوٹ سے ایک نیا دین ایجاد کریں گے اس وقت حق کو باطل، سچ کو جھوٹ، نیکی کو بدی، اور اللہ کی وحدانیت کو کفر و شرک کی ملاوٹ سے پاک کرنے کے لئے بے پناہ قربانیوں کی ضرورت پڑے گی اور فاطمہ زہراؑ کی یہ ننھی سی معصوم بچی ایسے ہی زمانوں میں حق کی پوری فوج بن کر باطل کے بڑے بڑے لشکروں کا تن تنہا مقابلہ کرے گی۔

اس وقت ان کی پیاری بیٹی فاطمہؑ نے جب ان سے رونے کی وجہ معلوم کی تو آپ نے کہا۔ ’’فاطمہؑ! میری یہ بچی تمہارے بعد بڑی بڑی مشکلات، طرح طرح کے دکھوں اور بے شمار مصائب سے گزرے گی۔‘‘

یہ سن کر حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی۔ فاطمہ زہراؑ تو آواز کے ساتھ رونے لگیں۔ جانتی تھیں کہ بابا نے جو کچھ کہا ہے ایسا ہی ہوگا۔

اس بچی کا نام رکھنے کے لئے اس کے نانا نے جبرئیلؑ کے آنے کا انتظار کیا۔ ذرا ہی

دیر میں جبرئیلؑ آسمان سے نازل ہوئے۔ انہوں نے اللہ کا پیغام اللہ کے رسولؐ کو پہنچایا۔ اس کے بعد اللہ کے رسولؐ نے اس بچی کا نام زینبؑ رکھا۔ زینبؑ کے نام کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مطلب حضرت زینبؑ کی شخصیت پر پورے اترتے ہیں۔ عربی زبان میں ''زینب'' کا مطلب ہے ''باپ کی زینت'' اور عبرانی زبان میں زینب کے معنی ہی بہت زیادہ رونے والی۔

☆☆☆

مدینہ منورہ میں یہ کچی اینٹوں اور گارے سے بنا ہوا ایک عام سا مکان تھا۔ مگر نہ جانے کیوں یہ گھر مدینے کے سارے گھروں سے الگ نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر راستہ چلنے والوں کی گردنیں احترام سے جھک جایا کرتیں۔ کئی لوگ اس گھر میں رہنے والوں سے حسد بھی کیا کرتے تھے لیکن جب اس گھر یا اس کے رہنے والوں کے سامنے آتے تو وہ مصنوعی عقیدت کا اظہار کرتے نظر آتے۔

اس گھر سے محبت کرنے والوں نے اکثر یہاں بڑے حیران کن منظر دیکھے تھے۔ رات کے اندھیرے میں کبھی یہاں آسمان سے کوئی ستارہ اترتا دکھائی دیتا۔ کبھی کوئی پڑوسی عورت کسی کام سے اس گھر میں جاتی تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ گھر میں ایک ماں بیٹھی چکی پیس رہی ہے اور اس کے بچے کا جھولا بغیر کسی کے جھلائے ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا ہے۔ اکثر لوگوں نے خود اپنے کانوں سے یہاں فرشتوں کے پروں کی آوازیں بھی سنی تھی۔

کچی اینٹوں اور گارے سے بنے ہوئے اس گھر کی دیواروں میں ایک انوکھی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو اس گھر سے محبت کرنے والوں کو اکثر محسوس ہوتی تھی۔ یہ پاک و پاکیزہ گھر کوئی عام گھر نہیں تھا۔ یہ وہ گھر تھا جس میں اللہ کے نور کی قندیل روشن تھی۔ یہ گھر ان گھروں میں سے تھا جن کا ادب و احترام کرنے کا حکم اللہ نے دیا تھا کیونکہ اس گھر میں صبح و شام اللہ کا نام لیا جاتا تھا اور اس کے رہنے والے ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کیا کرتے

تھے۔ یہ کوئی عام گھر نہیں تھا اس گھر کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

اس گھر میں تین بچے اپنے ماں باپ کے سائے میں زندگی گزار رہے تھے۔ بچوں کے باپ لشکر اسلام کے سپہ سالار حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے جو بدر و احد کی لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے تھے۔ جنگ احد میں تو اللہ کے رسولؐ کو دشمنوں سے بچاتے بچاتے ان کے جسم پر سولہ زخم آئے تھے لیکن ان کی بے جگری اور بہادری نے ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس جنگ کے دوران ان کی تلوار ٹوٹ کر زمین پر گری تو اللہ کے فرشتے جبرئیلؑ ان کے لئے آسمان سے ایک یادگار تلوار لے کر نازل ہوئے تھے۔ یہ تلوار بہت کم گھر میں رہتی تھی اسی لئے کہ اس زمانے میں آئے روز دشمنان اسلام سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ سپاہ اسلام کے نوجوان سپہ سالار کا زیادہ تر وقت جنگی حکمت عملی اور مدینے کی دفاعی انتظامات کی دیکھ بھال میں گزر جایا کرتا تھا اور یہ تلوار جس کا نام ذوالفقار تھا زیادہ تر علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔

بابا جان کچھ دیر کو گھر میں آتے تو حسنؑ و حسینؑ اکثر اس تلوار کے دستے کو چھو کر دیکھا کرتے تھے۔ حسنؑ و حسینؑ کی چھوٹی سی بہن نے اب پاؤں پاؤں چلنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں بھائی اپنی بہن پر جان چھڑکتے تھے۔ یہی حال ان کی چھوٹی بہن زینبؑ کا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھی ہوتیں اور جیسے ہی ان کے بھائی مسجد سے گھر میں آتے زینبؑ دوڑتی ہوئیں ان کے قریب آتیں اور بھائیوں کے چاروں طرف چکر لگانے لگتیں۔ گھر کے کاموں میں مصروف ان کی ماں اپنے بچوں کے درمیان اتنی محبت دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے ان بہن بھائیوں کو دیکھتی رہتیں اور پھر اپنے پلو سے آنکھوں کو پونچھ کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتیں۔

☆☆☆

اس بچی کے لئے اللہ کے رسولؐ نے جو پیش گوئی کی تھی اس کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ابھی یہ بچی پانچ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے نانا جانؐ دنیا سے چلے گئے۔ نانا

رسول اللہؐ اس گھر کا سائبان تھے۔ اب یہ سائبان سر سے اٹھ گیا تھا۔ رسول اللہؐ کے دنیا سے جانے کے بعد دنیا ہی بدل گئی۔ اس بچی نے چھوٹی سی عمر میں ایسے مناظر دیکھے کہ وہ سہم کر رہ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری حج سے واپسی پر لاکھوں مسلمانوں کو گواہ بنا کر اس کے والد علیؑ ابن ابی طالبؑ کو اپنے بعد مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کیا ہے لیکن نانا رسول اللہؐ کے دنیا سے جاتے ہی طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔

اس بچی کے والد لوگوں کو سمجھانے کی کوشش میں ناکام ہو کر گھر میں بیٹھ گئے لیکن اس کے باوجود ایک دن صبح ہی صبح کچی اینٹوں اور گارے سے بنے ہوئے گھر کے دروازے کو زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ اماں فاطمہؑ اٹھ کر دروازے تک گئیں۔ باہر سے تیز تیز باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اماں نے ذرا سا دروازہ کھولا ہی تھا کہ باہر سے ایک شخص نے دروازے پر اتنی زور کی لات ماری کہ دروازے کا بھاری پٹ چوکھٹ سے اکھڑ کر اماں فاطمہ زہراؑ پر آ گرا۔ گھر کی ملازمہ فضہ دوڑیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اماں فاطمہؑ کو اٹھایا اور انہیں بستر پر لا کر لٹا دیا۔ اماں فاطمہؑ کئی دن تک بستر پر پڑی درد سے کراہتی رہیں۔ پھر زینبؑ نے سنا ان کا ایک بھائی محسنؑ بھی تھا جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی شہید ہو گیا ہے۔

انہی دنوں میں ایک دن کچھ لوگ دروازہ کھول کر ان کے صحن میں آ گئے اور لشکر اسلامی کے نوجوان سپہ سالار کو رسی سے باندھ کر کہیں لے گئے۔ زینبؑ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ دنیا کے سب سے بہادر انسان نے اپنی اس ذلت کو خاموشی سے برداشت کیا لیکن تلوار نہ نکالی۔

چار پانچ سال کی زینبؑ کے لئے اس بات کو سمجھنا مشکل تھا کہ اس وقت دوسری طرح کی بہادری کی ضرورت تھی اور اس بہادری میں بھی ان کے باباؑ کی کوئی مثال نہیں تھی۔ وہ اس وقت تلوار نکال لیتے تو اسلام کا نوزائیدہ پودا اسی دن مرجھا گیا ہوتا۔

یہ سارے صدمے ننھی سی زینبؑ کو آنے والے زمانوں میں پیش آنے والے سخت

ترین مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔

☆☆☆

مدینے کی گلیوں میں سناٹا تھا۔ لوگ مغرب وعشاء کی نمازوں سے فارغ ہو کر جلدی سونے کو لیٹ گئے تھے۔ جمادی الثانی کا چاند ذرا دیر مغرب میں چمکنے کے بعد آسمان سے غائب ہو چکا تھا۔ ایسے میں چند افراد سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا ایک جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے، آنسو بہاتے دبے پاؤں قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی خاموشی سے روئے جا رہے تھے۔ ان میں سے ہر بچہ تابوت کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنا چاہتا تھا۔ یہ ان کمسن بچوں کی محبت کرنے والی ماں کا جنازہ تھا۔ دو بچے تابوت کے ساتھ ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملائے قدم بڑھا رہے تھے ان کی چھوٹی بہن زینبؑ جس کی عمر اس وقت بہ مشکل پانچ برس کی تھی سیاہ چادر میں لپٹی شمع کے لرزتے ہوئے اُجالے میں اپنے باپ کا ہاتھ تھامے قبرستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس بچی کے نہ آنسو رکتے تھے نہ ہچکیاں تھمتی تھیں۔ اس کا غم زدہ باپ چلتے چلتے بار بار اس بچی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیتا تھا۔ بچیوں کو عام طور پر قبرستان نہیں لے جایا جاتا لیکن اپنی ماں کی لاڈلی یہ بچی کسی طرح گھر پر رکنے کو تیار نہیں تھی۔ ماں کے بغیر گھر کا سناٹا اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہا تھا۔

اس بچی کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ اماں اسے ام کلثوم کہہ کر پکارتی تھیں۔ ام کلثوم ابھی بہت چھوٹی تھی اس لئے وہ اسماء بنت عمیس کے پاس گھر میں رک گئی تھی لیکن زینبؑ آج سے پہلے نہ اپنی ماں سے الگ ہوئی تھی اور نہ اپنے بھائیوں سے اس لئے وہ کسی صورت گھر پر ٹھہرنے کو تیار نہ ہوئی۔ مجبوراً امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ پانچ برس کی یہ بچی اس وقت شمع کے لرزتے ہوئے اندھیرے اجالے میں سسکیاں لیتی ہوئی آگے قدم بڑھا رہی تھی۔

اندھیرے میں راستہ دکھانے کے لئے یہ شمع صحابی رسولؐ حضرت سلمان محمدیؓ نے

ہاتھ میں بلند کر رکھی تھی۔ سلمان محمدیؓ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ اس وقت کو یاد کر رہے تھے جب فاطمہؑ بنت محمدؐ رخصت ہو کر اپنے باپ کے گھر سے اپنے شوہر علیؑ ابن ابی طالبؑ کے گھر جا رہی تھیں۔ اس وقت اللہ کے رسولؐ دعائیں پڑھتے ہوئے اپنی بیٹی کی عماری کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، صحابہ کرامؓ مؤدب انداز سے ان کے دائیں بائیں سر جھکائے مبارک سلامت کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ سواری کے اونٹ کی مہار تھامنے کی عزت سلیمان محمدیؓ کے ہاتھ آئی تھی۔

سلمان محمدیؓ اس وقت انہی ہاتھوں میں ایک شمع کو اٹھائے ہوئے تھے جس کی لرزتی روشنی میں رسول اللہؐ کی پیاری بیٹی فاطمہؑ بنتِ محمدؐ کا جنازہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔

اس جنازے میں جو رات کی تاریکی میں اٹھایا گیا تھا مسلمانوں کے بھرے پُرے شہر سے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کمسن بچوں حسنؑ و حسینؑ اور سلیمان محمدیؓ کے علاوہ صرف آٹھ آدمی شریک تھے۔ مدینے کے باقی تمام مسلمان آج زیادہ گہری نیند سو رہے تھے۔ باپ کو رونے والی بیٹی کے نالہ و فریاد کی آوازیں آج ان کی نیند میں خلل نہیں ڈال رہی تھیں۔

اپنی ماں کے جنازے کے ساتھ چلنے والی اس معصوم بچی کو وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اماں فاطمہؑ اپنے بابا جان کے غم سے بے حال ہو کر روتیں تو ذرا ہی دیر بعد پڑوس کے گھروں کی عورتیں آ کر دروازہ بجانے لگتیں اور کہتیں۔ ”فاطمہ! اس طرح نہ رویا کرو تمہارے رونے سے ہماری نیندیں خراب ہوتی ہیں۔ ہمارے مرد نہ دن میں آرام کر پاتے ہیں نہ رات میں۔ تم کوئی ایک وقت مقرر کر لو اپنے رونے کے لئے۔“

روز روز کی ان باتوں سے تنگ آ کر بابا علیؑ ابن ابی طالبؑ نے آبادی سے فاصلے پر اپنی شریک حیات کے لئے ایک قبرستان کے قریب ایک چھپر ڈال دیا تھا۔ اماں فاطمہؑ صبح سویرے گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر چادر سر پر ڈالتیں، بچوں کی انگلی تھامتیں اور مدینے سے نکل کر اس ویرانے میں جا کر بیٹھ جایا کرتیں تاکہ اپنے پیارے باپ کی جدائی پر جی بھر

کے آنسو بہا سکیں۔

باپ کی جدائی میں کئی مہینے تک بے پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی رسول اللہؐ کی بیٹی آج دنیا سے منہ موڑ کر اپنے باپ کے پاس جا رہی تھی۔ مدینے کے گھروں میں لوگ آج سکون کی نیند سو رہے تھے۔ آج نہ انہیں فاطمہؑ کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور نہ ان کے ضمیر کی خلش انہیں بے چین کر رہی تھی۔

☆☆☆

علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اپنی ایک الگ دنیا تعمیر کر لی تھی۔ اس دنیا میں قرآن کو ترتیب دیا جا رہا تھا، تفسیر لکھی جا رہی تھی، رسولؐ اللہ کی احادیث یکجا کی جا رہی تھیں، علم کے پیاسوں کو علم بانٹا جا رہا تھا۔ عوام کی فلاح و بہبود کے کام کیے جا رہے تھے۔ کنویں کھد رہے تھے، درخت لگائے جا رہے تھے، علم قرآن و حدیث کے عالم تیار ہو رہے تھے۔ یہ سخت محنت اور جدوجہد کا دور تھا۔ اس دور میں اسلام مکے اور مدینے میں اپنے زخموں سے تڑپ رہا تھا اور مسلمان فوجیں دوسرے ملکوں کی سرحدیں عبور کر رہی تھیں۔

رسول اللہؐ کو دنیا سے گئے تیئس چوبیس برس گزر گئے لیکن کچی اینٹوں اور گارے سے بنے ہوئے اس گھر میں کوئی لمحہ رسول اللہؐ کے ذکر سے خالی نہ ہوتا تھا۔ حسنؑ و حسینؑ جوان ہو چکے تھے، چھوٹی سی بچی زینبؑ بڑی ہو گئی تھی۔ زینبؑ اب دنیا کی سیاست، لوگوں کے رویوں اور معاشرے کے مزاج کو سمجھنے لگی تھیں۔

یہ سن پینتیس ہجری کا زمانہ تھا۔ اس عرصے میں کئی حکومتیں بدلیں۔ عوام نے ہر حکومت سے توقعات وابستہ کیں لیکن جلد ہی مایوسی کا شکار ہو گئے۔ معاشرے کا ایک خاص طبقہ ہر حکومت میں شامل رہا اور اس سے فائدے اٹھاتا رہا۔ سن پینتیس ہجری میں حالات نے پلٹا کھایا اور وہ لوگ جو پہلے علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بات سننے کو تیار نہیں تھے اب انہیں زینبؑ کے باپ کی فضیلتیں یاد آنے لگیں۔

پھر ایک دن عراق، مصر، شام، حجاز، فلسطین اور یمن کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا

وفد کچی اینٹوں اور گارے سے بنے ہوئے اس مکان پر آیا اور اس نے علیؑ ابن ابی طالبؑ سے درخواست کی وہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ بابا علیؑ ابن ابی طالبؑ انکار کرتے رہے۔ پھر ایک دن مسجد نبویؐ میں ہزاروں مسلمانوں نے انہیں اپنا حکمران بنانا چاہا تب بھی علیؑ ابن ابی طالبؑ تیار نہ ہوئے لیکن مسلمانوں کے بے حد اصرار پر انہیں مجبوراً خلافت کی خالی کرسی سنبھالنا پڑی۔

لیکن علیؑ ابن ابی طالبؑ نے حکومت سنبھالنے کے بعد اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مطابق اقدامات کرنا شروع کیے تو لوگ برداشت نہ کر سکے۔ حمایت کرنے والے مخالف ہو گئے۔ ساتھ رہنے کا وعدہ کرنے والے حکومت کو ناکام کرنے میں لگ گئے۔ پانچ برس کا دورِ حکومت خوں ریز لڑائیوں، سرحد پار سے ہونے والی دہشت گردی اور طرح طرح کی سازشوں سے نمٹنے میں گزر گیا۔ سازشوں کے پیچ در پیچ جال بچھائے گئے تھے جس کے نتیجے میں زینبؑ کے پیارے بابا انیس رمضان کو قاتل کی زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے حالت نماز میں اپنے خون میں نہا گئے۔ یہ زخم اتنا کاری تھا کہ ۲۱ رمضان کی صبح زینبؑ کے بابا علیؑ ابن ابی طالبؑ ۶۳ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اپنے پیارے باپ کے اس سفاکانہ قتل سے زینبؑ ایک بار پھر گہرے دکھوں میں گھر گئیں۔ نانا جانؐ کی یاد میں اپنی ماں فاطمہ زہراؑ کا مہینوں بے قرار ہو کر تڑپنا اب زینبؑ کی سمجھ میں آیا!

☆☆☆

اس گھر کے سب بچے اب بڑے ہو چکے تھے۔ سب کے گھر آباد ہو چکے تھے۔ زینبؑ بھی اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ ان کی سسرال ان کے چچا جعفر طیارؓ کا گھر تھا۔ چچا کے بیٹے عبداللہؓ زینبؑ کے شوہر تھے۔ اپنے گھر بار کی ہونے کے باوجود زینبؑ دن میں اپنے میکے کا ایک چکر ضرور لگاتی تھیں۔ بھائی حسنؑ و حسینؑ تو ان کی محبتوں کا مرکز تھے ہی لیکن جب سے بھائیوں کے گھر اولاد ہوئی تھی تو زینبؑ اپنے بھائیوں کی اولاد کو دیکھ دیکھ کر

جیتی تھیں۔ ان کی بھابیاں بھی ان کا بے پناہ احترام کرتی تھیں۔ زینبؑ آتیں تو بھائیوں کے بچوں کو لے کر بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں ان کے ساتھ رہتیں۔

حکومت اسلامی کا دارالحکومت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے زمانے میں کوفہ تھا لیکن اب اسے دوبارہ مدینے منتقل کر دیا گیا تھا۔ کوفے میں جناب زینبؑ کا قائم کردہ خواتین کا مدرسہ اب بھی قائم تھا لیکن جناب زینبؑ بھائیوں کی وجہ سے مدینے لوٹ آئی تھیں۔ حجاز کے مسلمانوں نے امام حسنؑ کی بیعت کر لی تھی لیکن شام کے صوبے کا گورنر نواسۂ رسولؐ کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لئے امام حسنؑ کے خلیفہ بنتے ہی ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ سرحدی علاقوں میں چھاپہ مار کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ دشمنوں کے مسلح دستوں نے حجاز کی بستیوں میں گھس کر آئے دن لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امام حسن علیہ السلام کے خلاف ان مسلح کارروائیوں اور گہری سازشوں کے ساتھ ساتھ ان کی کردار کشی کی مہم بھی اپنے عروج پر تھی۔

زینبؑ اپنے بھائی کے خلاف ہونے والی ان سازشوں کو محسوس کرتیں اور ہر وقت بھائی کی زندگی کی دعائیں مانگا کریں۔ شاید یہ ان کی دعائیں ہی تھیں کہ دشمنوں نے چھ مرتبہ مختلف طریقوں سے ان کے بھائی کو زہر دینا چاہا لیکن وہ بچ گئے۔ اس سلسلے کی آخری کوشش میں خود امام حسنؑ کی بیوی کو استعمال کیا گیا۔ اس بدبخت عورت نے شام کے شہزادے سے شادی کے لالچ میں نواسہ رسولؐ کو زہر کے ذریعے شہید کر دیا۔ زینبؑ کے بڑے بھائی حسنؑ ابن علیؑ کے کلیجے کے ٹکڑے جب ایک برتن میں گر رہے تھے تو زینبؑ کا اپنا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ باپؑ کی شہادت کے دس سال بعد زینبؑ کے بڑے بھائی حسنؑ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔

☆☆☆

زینبؑ کی محبتوں کا اب ایک ہی مرکز رہ گیا تھا۔ یہ حسینؑ تھے زینبؑ کے بھائی۔ ان دونوں بہن بھائیوں کی عمروں میں ایک سال کا فرق تھا۔ حسینؑ اپنی بہن سے ایک سال

بڑے تھے لیکن اپنی بہن کو ماں کی طرح سمجھتے تھے۔ حسینؑ کے سارے بچے اپنی پھوپھی ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ زینبؑ کے اپنے بھی دو بیٹے تھے۔ زینبؑ اپنے بچوں کو اکثر ساتھ لے کر اپنے بھائی کے گھر آجایا کرتیں۔ سب بچے اپنے کھیل کود اور باتوں میں لگ جاتے اور زینبؑ اپنے چہیتے بھائی کے ساتھ بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتیں۔ آنے والے زمانے کے لئے حکمت عملی تیار کی جاتی۔

اماں ام البنینؓ نے اس گھر کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ بی بی ام البنینؓ سے علیؑ ابن ابی طالبؑ نے جناب زہراؑ کی شہادت کے کافی عرصے بعد شادی کی تھی۔ گھر میں چھوٹی چھوٹی دو بچیاں تھیں، دو بچے تھے انہیں کون سنبھالتا۔ اب بی بی ام البنینؓ کے چار بیٹے جوان ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑے عباسؑ تھے۔ عباسؑ شروع ہی سے اپنے بڑے بھائی حسینؑ کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ بڑے ہوئے تو انہوں نے بڑے بھائی کو اپنے باپ کی طرح سمجھا اور ایک فرماں بردار غلام کی طرح ہر لمحے ان کے ساتھ ساتھ رہنے لگے کہ جانے کب آقا کوئی حکم دیں اور غلام کو اپنے آقا کی خدمت کا موقع ملے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب شام میں یزید ابن معاویہ نے مسلمانوں کی حکومت کا تخت و تاج سنبھالا اور حسین علیہ السلام سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ اس طرح زینبؑ کی زندگی میں مصائب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ حسینؑ نے مدینے سے مکے کی طرف سفر شروع کیا۔ مکے میں تین ماہ ٹھہرنے کے بعد آل رسولؐ کا یہ قافلہ عراق کے لئے روانہ ہوا۔ سفر کی سخت مشکلات کو طے کرتے ہوئے حسین علیہ السلام اپنی بہن زینبؑ اور تمام اہل حرم کے ساتھ کربلا پہنچے تھے۔

عاشور کے دن زینبؑ کے بھائی اور رسولؐ کے نواسےؑ کو ان کے خاندان کے مردوں، جوانوں اور بچوں سمیت تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کر دیا گیا۔ اہل حرم کے خیمے جلا دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو قید کر کے کوفے اور وہاں سے شام پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

آگ اور خون کے اس سمندر میں اہل بیتؑ کی کشتی کی ناخدا زینبؑ ہی تھیں۔ اس طوفانی سمندر سے اہل بیتؑ کی کشتی کو سلامت نکالنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی اس شیر دل بیٹی ہی کا کام تھا۔ آگ اور خون کا یہ طوفانی سمندر کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام تک پھیلا ہوا تھا۔ حکومت کے مشیروں، خفیہ ایجنٹوں، ظالم فوجیوں، مغرور سرداروں، درباری مولویوں اور جھوٹ لکھنے والے قلم کاروں کے عظیم لشکر کے سامنے زینبؑ تنہا خدا کی فوج، نبیؐ کا پیغام اور علیؑ کی تلوار بنی ہوئی تھیں۔

وہ علیؑ کی تلوار ہی نہیں امامت کی ڈھال بھی تھیں اسی لئے وہ اپنی جان پر کھیل کر امامت کو بچا لے گئیں۔ یزید کے لشکر ہار گئے، شیطان کے جھنڈے سرنگوں ہو گئے۔ یزید نے حسینؑ ابن علیؑ کے گھر والوں کو قیدی بنانا چاہا تھا لیکن کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں زینبؑ بنت علیؑ کے خطبوں اور تقریروں نے خود یزید کو قیدی بنا کر اس کے محل میں قید کر دیا تھا۔ آخر یزید نے خود اپنی زنجیروں کو ہلکا کرنے کے لئے اہل حرم کو آزاد کر کے مدینے بھیجنے کے انتظامات کیے۔ اہل حرم کے ان قیدیوں کا قافلہ مدینے پہنچا۔

زینبؑ بنتِ علیؑ کی ذمے داریاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے مدینے میں عوام کی سیاسی بیداری کے لئے عزاداری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مدینے والے ابھی تک تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے رہے تھے۔ اب انہوں نے کربلا کے واقعات، امام حسینؑ کے اقدامات، یزیدی ظلم وستم کی تفصیلات خود حسین مظلومؑ کی بہن کی زبان سے سنے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

مدینے کی فضا میں تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ایسے میں یزیدی حکومت کے جاسوسوں کے کان کھڑے ہوئے۔ خفیہ رپورٹیں مدینے سے شام جانے لگیں۔ ہرکارے دوڑنے لگے، یزیدی بیوروکریسی حرکت میں آ گئی۔ خفیہ ایجنسیوں نے حکومت کو مشورے دینا شروع کیے اور پھر ایک دن حاکم شام کے دربار سے مدینے کے گورنر کے نام ایک خفیہ مراسلہ جاری ہوا جس میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ حسینؑ کی بہن زینبؑ کو مدینے

سے نکال دیا جائے۔ یہ سن ۶۲ ہجری کا آغاز تھا۔

حکومت کے کارندوں نے جناب زینبؑ کے شریک حیات عبداللہ ابن جعفرؓ سے مل کر مرکزی حکومت کے احکامات پر عمل درآمد کرانا چاہا۔ پہلے تو جناب زینبؑ نے مدینہ چھوڑنے سے انکار کیا لیکن خاندان کی عورتوں اور اپنے شوہر عبداللہ ابن جعفرؓ کے سمجھانے بجھانے پر شام جانے پر رضا مند ہو گئیں۔ جناب عبداللہؓ بہت دولت مند انسان تھے۔ شام میں ان کی زرعی زمینیں تھیں۔ جناب عبداللہؓ اپنی شریک حیات کو مدینے سے شام لے کر چلے گئے اور وہاں دمشق کے ایک گاؤں ''راویہ'' میں اپنی زمینوں اور باغات کے درمیان رہائش اختیار کر لی۔

علیؑ ابن ابی طالبؑ کی شیر دل بیٹی، فاطمہ زہراؑ کی لاڈلی اب عمر کے آخری حصے سے گزر رہی تھیں۔ بی بی زینبؑ کی عمر اس وقت پچپن سال ہو چکی تھی۔ انہوں نے گزشتہ پچاس برسوں میں جن مشکلات و مصائب کا سامنا کیا تھا۔ ان میں سے صرف کربلا کا سانحہ ہی بچوں کو بوڑھا کر دینے کو کافی تھا۔ شام آنے کے بعد آپؑ کی طبیعت ناساز رہنے لگی اور بالآخر رجب کے مہینے میں ایک شام کوفہ و شام کے درباروں کو اپنی تقریروں سے لرزا دینے والی رسولؐ کی یہ بہادر نواسیؑ اپنے مظلوم بھائی کو یاد کرتے کرتے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ جناب زینبؑ کو انہی کے باغ میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ باغ پہلے ایک چھوٹے سے گاؤں ''راویہ'' میں تھا۔

آج جناب زینبؑ کی قبر مبارک کے اردگرد ایک سجا سجایا ترقی یافتہ شہر آباد ہے۔ اس شہر کو ''سیدہؑ کا شہر'' کہا جاتا ہے۔ اس شہر کا نام ''زینبیہ'' بھی ہے۔ یہاں بین الاقوامی معیار کے دینی مدرسے، عظیم تبلیغی ادارے اور بڑے بڑے علمی مراکز کام کر رہے ہیں حسینؑ کے چاہنے والے علیؑ کی شیر دل بیٹی زینبؑ کے روضہ مبارک پر حاضری دینے کے لئے سارے کرہ ارض سے سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ حسینؑ کشتی امت کے ناخدا ہیں لیکن زینبؑ بنتِ علیؑ اس عظیم ہستی کا نام ہے

جس نے حسینؑ کی کشتی کو آگ اور خون کے سمندر سے بہ حفاظت نکال کر انسانی ضمیر اور تاریخ کے محفوظ ساحلوں تک پہنچایا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ جناب زینبؑ کا روضہ مبارک دمشق میں ہے لیکن مصر کے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ علیؑ کی بیٹی زینبؑ کا مزار مصر کے شہر قاہرہ میں ہے۔ مصر میں کئی مقامات ایسے ہیں جن کے بارے میں مصریوں کا عقیدہ ہے کہ یہاں زینبؑ بنت علیؑ آرام کر رہی ہیں۔ مصر میں ان مقامات کو ''مشاہد زینبی'' کہا جاتا ہے۔

یہ قدرت کے انتظامات ہیں۔ اللہ کے دشمنوں کی قبریں، اگر بنی بھی تھیں تب بھی بہت جلد مٹ گئیں، بڑے بڑے بادشاہوں کی قبروں اور نسلوں کا نام ونشان مٹ گیا، اس کے برعکس جن ہستیوں نے اپنے زمانے کے فرعونوں اور نمرودوں کا مقابلہ کیا، ان کی قبریں جہاں تھیں وہاں پوری شان وشوکت کے ساتھ برقرار رہیں اور جہاں نہیں تھیں وہاں بھی ان کی قبریں، شاندار روضے اور یادگاریں زمین کے سینے پر جگمگانے لگیں۔

☆☆☆☆
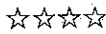
علیؑ کی دُعا

خلافت کے معاملے میں حضرت علی علیہ السلام نے وہی فیصلہ کیا جو بچے کی حقیقی ماں نے کیا تھا کہ بچے کے دو ٹکڑے نہ کیے جائیں، اسے جھوٹی ماں کے حوالے کردیا جائے۔ اس طرح بچہ کم از کم زندہ تو رہے گا!

—*****—

جناب زہراؑ کی شہادت کو چودہ برس گزر چکے تھے۔ آپ کی شہادت کے وقت بچے بہت چھوٹے تھے۔ حسنؑ و حسینؑ کی عمریں سات آٹھ برس کی تھیں۔ زینبؑ وام کلثومؑ بھائیوں سے بھی چھوٹی تھیں۔ شریکِ حیات کی موت سے تو امیر المومنین علیہ السلام کا گھر ہی اجڑ گیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ دین اسلام کو اب نئے مسائل ومشکلات کا سامنا تھا۔ کفار ومشرکین کے سروں کو کاٹنے والے علی ابن ابی طالبؑ نے اپنی تلوار کو نیام میں رکھ لیا تھا۔ اس وقت دین اسلام کی مثال اس بچے کی طرح تھی جس کے بارے میں دو عورتوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کا بچہ ہے۔ ایسے میں جب حضرت علی علیہ السلام نے فیصلہ کیا کہ بچے کے دو ٹکڑے کرکے دونوں عورتوں کو دے دیئے جائیں تو بچے کی اصلی ماں نے بے ساختہ چیخ کر کہا تھا کہ نہیں بچے کے دو ٹکڑے نہ کریں بلکہ اسے دوسری عورت کو دے دیں۔ اصلی ماں جانتی تھی کہ اس طرح میرا بچہ مجھے ملے یا نہ ملے، کم از کم زندہ تو رہے گا۔

سن گیارہ ہجری میں رسول اللہؐ کی شہادت کے بعد حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کرلیا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے بچے کی حقیقی ماں کی طرح یہ فیصلہ کیا کہ خلافت انہیں ملے یا نہ ملے لیکن اسلام کا نوزائیدہ پودا محفوظ رہ جائے۔ بچہ جب بڑا ہوگا۔ اُسے عقل و شعور آئے گا خود ہی اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے گا۔

آپ کو معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ان کے بیٹے حسینؑ کو دین اسلام کی زندگی کے لئے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دینا ہوگی۔ یہ قربانی حسینؑ ایک خاص وقت میں اس انداز سے پیش کریں گے کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور انہیں حکمرانوں کے چہرے پر پڑی ہوئی اسلام کی نقاب کے پیچھے سے ان کا اصل چہرہ نظر آنے لگے گا۔ حضرت علی علیہ السلام جانتے تھے کہ جس طرح رسول اللہؐ نے کفر و جہالت کی تاریکیوں میں دین اسلام کی مشعل روشن کی تھی اسی طرح ان کا بیٹا حسینؑ اس بجھتی ہوئی مشعل کو اپنے خون سے دوبارہ روشن کرے گا۔

امیر المومنین علیہ السلام اکثر سوچا کرتے تھے کہ جب اللہ کے رسولؐ نے انقلاب اسلامی کی بنیادیں رکھی تھیں اس وقت تو میں رسول اللہؐ کی حفاظت کیا کرتا تھا لیکن جب حسینؑ دین اسلام کو زندہ کرنے کے لئے ایک انقلاب کا آغاز کریں گے تو ان کی حفاظت کون کرے گا۔ حسینؑ جب مشکلات و مصائب میں گھریں گے تو کون ان کے چہرے سے درد و غم کے بادلوں کو دور کرے گا! کیوں کہ اس وقت نہ میں ہوں گا، نہ حسنؑ ہوں گے۔

آپؑ اکثر دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کیا کرتے کہ بارالہا! مجھے ایک ایسا بہادر بیٹا عطا فرما جو کربلا میں حسینؑ کے لئے وہی خدمات انجام دے جو میں رسول اللہؐ کے لئے انجام دیا کرتا تھا۔

ایک دن آپؑ نے اپنے بھائی عقیلؓ سے مشورہ کیا۔ ''بھائی! آنے والے زمانے میں جو کچھ ہوگا وہ مجھے معلوم ہے۔ خود اللہ کے رسولؐ آنے والے واقعات کی پیش گوئی فرما چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں جب حسینؑ اپنے زمانے میں دینِ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے

لئے انقلاب کا آغاز کرے تو اس وقت اس کے ساتھ میرا ایک بہادر بے حد وفادار اور دلیر بیٹا موجود ہو۔"

"لیکن حسینؑ بھی تو آپ کے بیٹے ہیں!" جناب عقیلؓ بولے۔

"حسنؑ و حسینؑ میری اولاد ہیں لیکن فرزند رسولؐ ہیں۔ رسول اللہؐ کے بیٹوں کی حفاظت کے لئے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے ایک بے مثال بہادر، دلیر اور باوفا بیٹا عطا فرمائے۔" امیر المومنین علیہ السلام نے جواب دیا۔

"آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو بتائیں۔" جناب عقیلؓ نے کہا۔

"بھائی! آپ عرب کے تمام قبیلوں اور خاندانوں کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کسی ایسی خاتون کو تلاش کریں جو بہادروں کے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہو۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ ایک ایسے بچے کی ماں بنے جس میں ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شرافت، بہادری، سرفروشی اور دلیری کی صفت موجود ہو اور یہ بچہ بڑا ہو کر رسول اللہؐ کے بیٹوں حسنؑ و حسینؑ کی حفاظت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑے۔" حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دل کی بات اپنے بھائی سے بیان کی۔

جناب عقیلؓ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ آپ عرب کے تمام خاندانوں، ان کے بزرگوں، ان کی روایات اور کارناموں سے واقف تھے۔ انہیں اس سلسلے میں ایک ماہر کی سی حیثیت حاصل تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد آپ کا چہرہ چمک اٹھا۔ "علیؑ! آپ فاطمہ کلابیہ سے عقد کرلیں۔ فاطمہ کا قبیلہ "کلاب" شجاعت، جواں مردی اور بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔" جناب عقیلؓ نے حضرت علی علیہ السلام کو جناب فاطمہ کلابیہ کے خاندان کے بارے میں بتایا۔

حضرت علی علیہ السلام نے اس رشتے پر پسندیدگی کا اظہار کیا تو اگلے ہی روز جناب عقیلؓ قبیلہ کلاب جا پہنچے۔ جناب فاطمہ کلابیہ کے والد حزام ابن خالد انہیں اچھی طرح جانتے تھے انہوں نے جناب عقیلؓ کو بہت عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا اور آنے کا مقصد پوچھا۔

جناب عقیلؓ نے کہا۔ ''محترم! میں آپ کی صاحبزادی فاطمہ کلابیہ کے لئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا رشتہ لے کر آیا ہوں۔''

حزام ابن خالد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ علیؑ ابن ابی طالبؑ کا رشتہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حزام جانتے تھے کہ اس وقت سارے عرب تو کیا سارے کرہ ارض پر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے بلند تر کوئی ہستی موجود نہیں تھی۔ انہوں نے خوشی اور فخر کے ساتھ جناب عقیلؓ کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''علی علیہ السلام سے میری بیٹی کا عقد ہونا میری بیٹی اور میرے پورے خاندان کے لئے ایک عظیم سعادت ہوگی۔ آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیٹی کو بھی یہ خوش خبری سنا دوں۔''

''ضرور! رشتے کے سلسلے میں لڑکی کی مرضی ضرور معلوم کرنا چاہیے۔'' جناب عقیل نے جواب دیا۔

جناب حزام گھر کے اندر چلے گئے۔ آپ نے اپنی بیٹی کو اس رشتے کے بارے میں بتایا اور ان سے رائے مانگی۔ جناب فاطمہ کلابیہ کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو چکا تھا۔ آپ نے شرماتے شرماتے کہا۔ ''اختیار تو آپ کے پاس ہے لیکن میں اس رشتے پر بے حد خوش ہوں۔''

یہ سن کر حزام خوشی خوشی باہر آئے اور انہوں نے جناب عقیلؓ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رشتہ میری خوش قسمتی کا سبب ہے۔ آپ دن اور تاریخ مقرر کر لیں۔''

اس طرح یہ رشتہ طے ہو گیا۔ چند دن کے بعد نکاح کی رسم ادا ہوئی اور جناب فاطمہ کلابیہ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے گھر آ گئیں۔

دلہنیں رخصت ہو کر جب سسرال آتی ہیں تو شوہر، اس کے گھر اور خاندان پر حکمرانی کے خواب اپنے دل میں لے کر آتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے گھر کی ملکہ بننا چاہتی ہیں لیکن جناب فاطمہ کلابیہ جب امیر المومنینؑ کے گھر میں آئیں تو انہیں اس بات کا پورا احساس تھا

کہ وہ جس گھر میں آئی ہیں وہ کوئی عام گھر نہیں۔ یہ وہ گھر تھا کہ جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو نبیوںؑ کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم روزانہ صبح کے وقت یہاں آتے اور دروازے کی چوکھٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا کرتے تھے ''اے اہلِ بیتِ نبوت تم پر سلام ہو۔''

یہ گھر وہ ہے جہاں فرشتے آتے جاتے تھے۔ یہ وہ گھر ہے جہاں کبھی خاتونِ جنت جناب زہرا صلوات اللہ علیہا چلتی پھرتی تھیں۔

یہ گھر فاطمہ زہراؑ کا گھر تھا، یہ گھر مولائے کائناتؑ کا گھر تھا۔ اس پاک و پاکیزہ گھر میں جنت کے جوانوں کے سردار، رسول اللہ کے فرزند حسنؑ و حسینؑ رہتے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کی آنکھوں کی ٹھنڈک زینبؑ و امِ کلثومؑ اسی گھر میں رہتی تھیں۔

آج اللہ نے اپنے فضل و کرم سے فاطمہ کلابیہ کو یہ عزت و شرف عطا کیا تھا کہ وہ اس مقدس و متبرک گھر میں قدم رکھ سکیں جس کے رہنے والوں سے محبت کرنا رب العالمین نے واجب قرار دیا تھا۔ آج فاطمہ کلابیہ ایک ایسی ہستی کی شریکِ حیات بن گئی تھیں جن کے چہرے کی طرف دیکھنا ہی عبادت تھا۔

اسی لئے جناب فاطمہ کلابیہ جب اس گھر میں داخل ہونے لگیں تو دروازے میں قدم رکھتے ہوئے آپ کا دل اللہ کے شکرانے کے احساس سے بھر گیا۔ آپ نے اندر قدم رکھنے سے پہلے دروازے کی چوکھٹ کو چوما اور آپ کی آنکھیں شکرانے کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔

حسنؑ و حسینؑ اپنی ماں جناب زہراؑ کی شہادت کے وقت سات آٹھ برس کے تھے، اب بائیس تیئس برس کے جوان تھے۔

جناب زینبؑ و ام کلثومؑ گھر کو سنبھالنے کے قابل ہو گئیں تھیں۔ ان دنوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو بخار آ رہا تھا۔ وہ اپنے بستروں میں لیٹے ہوئے تھے۔ جناب زینبؑ و ام کلثومؑ نے آگے بڑھ کر خوش دلی سے جناب فاطمہ کلابیہ کا استقبال کیا۔ جناب فاطمہ کلابیہ

نے ان دونوں کو گلے سے لگا کر پیار کیا ان کے ہاتھوں کو عقیدت سے بوسہ دیا اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی طرف بڑھیں جو اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

آپ پہلے تو ان دونوں کے گرد تین مرتبہ گھوم کر ان پر قربان ہوئیں۔ مادرانہ شفقت محبت اور انتہائی ادب و احترام کے ساتھ ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور روتے ہوئے بولیں۔"اے میرے آقا زادو! میں آپ کی ماں بن کر نہیں بلکہ آپ کی خادمہ بن کر اس گھر میں آئی ہوں۔ مجھے اپنی خادمہ کی حیثیت سے قبول فرمائیں۔ میری جان آپ پر قربان ہو جائے... میں آپ کے کپڑے دھوؤں گی، گھر کے کام کروں گی اور دل و جان کے ساتھ آپ سب کی خدمت کیا کروں گی۔"

تاریخ کی کتابوں میں تفصیل نہیں ملتی کہ بی بی ام البنین کی ان باتوں کا جناب حسنؑ و حسینؑ اور جناب زینبؑ و ام کلثومؑ نے کیا جواب دیا لیکن ساری دنیا کو اخلاق سکھانے والے اس گھرانے کی روایات کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بچوں نے اپنی دوسری ماں کے ادب و احترام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہوگی۔ حسنؑ و حسینؑ تمام مومنین و مومنات کے آقا و مولا تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے گھر کی خادمہ کو بھی "اماں فضہ" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

☆☆☆

امیر المومنین علیہ السلام کے گھر کی رونقیں کسی حد تک بحال ہو چکی تھیں۔ گھر سے باہر حضرت علی علیہ السلام اس وقت بھی حالت جنگ میں تھے لیکن دشمنوں کے خلاف یہ جنگ اب زبان و قلم کے ساتھ لڑی جا رہی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے خطبات کے ذریعے مسلمانوں کی رہنمائی کرتے، باغوں اور کھیتوں میں محنت کرتے، کنویں کھودتے اور انہیں مسلمانوں کے لئے وقف کرتے رہتے۔ جناب ام البنین کی شادی کو تقریباً ایک سال گزر چکا تھا۔ شعبان کے مہینے کا آغاز تھا۔ شعبان کے چاند کی روشنی ہر روز بڑھتی جا رہی تھی کہ چار شعبان کو امیرا لمومنین علیہ السلام کے گھر میں بنی ہاشم کا چاند طلوع ہوا۔ یہ عباس علمدارؑ تھے۔ امیر المومنینؑ کی

تمنا، حسنؑ کے محافظ حسینؑ کے قوت بازو، زینبؑ و ام کلثومؑ کے دلوں کی ڈھارس۔

جانے کیا بات تھی کہ یہ چھوٹا سا بچہ شروع ہی دن سے اپنے بھائی حسینؑ سے زیادہ مانوس تھا۔ ایک دن حسین علیہ السلام اپنے چھوٹے بھائی کو گود میں لئے پیار کررہے تھے کہ امیر المومنینؑ گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بھی آ کر چھوٹے سے بچے کو پیار کیا۔ اس وقت امام حسین علیہ السلام نے اپنے بابا سے پوچھا۔ ''بابا جان! جانے کیا بات ہے کہ میں جب بھی عباسؑ کو پیار کرتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے۔''

''اس کی ایک وجہ ہے۔'' امیر المومنینؑ نے کہا۔ ''آج یہ بچہ تمہیں خوش کررہا ہے لیکن ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ تم اس کے لئے آنسو بہاؤ گے۔ جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کربلا کی خبر لے کر آئے تھے تو انہوں نے رسول اللہؐ کو بتادیا تھا کہ عباسؑ، حسینؑ سے پہلے شہید ہوں گے اور علمدار کربلا کہلائیں گے۔'' یہ کہتے کہتے امیر المومنین علیہ السلام کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

☆☆☆

حضرت ابوالفضل عباسؑ کے بہت سے القاب ہیں۔ قمر بن ہاشمؑ، علمدار لشکر حسینؑ، سقائے سکینہؑ، تاجدارِ وفا، حسینؑ کے چہرے سے غم کے بادل ہٹانے والے۔ آپ کا نام عباسؑ ہے۔ عباسؑ شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی کہ مجھے ایک ایسا بیٹا عطا فرما جو کربلا کے میدان میں حسینؑ کے لیے اپنی جان قربان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین علیہ السلام کو حضرت عباسؑ کے علاوہ تین مزید ایسے جری، بہادر اور جانثار بیٹے عطا کیے جنہوں نے کربلا کے میدان میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک اللہ کی راہ میں قربان کر کے درجہ شہادت حاصل کیا۔

جنگ صفین جو ۳۶ ہجری میں دریائے فرات کے مغربی کنارے پر لڑی گئی، اس جنگ میں اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ حضرت عباسؑ بھی لشکر اسلامی میں موجود تھے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ اس جنگ کے دوران جب حکومت اسلامی کے

باغیوں سے دست بہ دست لڑائی ہورہی تھی تو حضرت عباسؑ بے جگری اور بہادری کے ساتھ تلوار چلا رہے تھے۔ لڑتے لڑتے آپ کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ جب آپ کی پیاس ناقابل برداشت ہونے لگی تو آپ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے۔ ''بابا جان! پیاس برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔'' آپ نے عرض کی۔

حضرت علی علیہ السلام نے ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا بھر کر انہیں دیا۔ حضرت عباسؑ نے پانی پی کر سکون حاصل کیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگے۔ اس وقت حضرت علی علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''بابا جان! آپ رو رہے ہیں۔!'' حضرت عباسؑ نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں...'' حضرت علی علیہ السلام نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولے۔'' دراصل اس وقت تمہاری پیاس سے مجھے ایک اور پیاس کی یاد آ گئی کہ جب تمہارے سامنے دریا بہہ رہا ہوگا مگر تم اپنی پیاس نہیں بجھا سکو گے۔''

''بابا جان! وہ کون سا زمانہ ہوگا؟'' جناب عباسؑ نے سوال کیا۔

''یہ واقعہ سن اکسٹھ ہجری میں پیش آئے گا جب نہ میں ہوں گا نہ حسنؑ ہوں گے۔ اس وقت تمہارا آقا، حسینؑ ہوگا اور وہ بھی تمہاری طرح پیاسا ہوگا۔'' حضرت علی علیہ السلام نے بتایا۔

''بابا! کیا فرزند رسولؐ پر بھی پانی بند ہوگا۔ ایسا ظلم کون لوگ کریں گے۔؟''

''بیٹا! وہ اسی گروہ کے لوگ ہوں گے جو اس وقت تمہارے سامنے ہیں اور اس وقت بھی ہم سے جنگ کر رہے ہیں۔''

''بابا جان! اس وقت ہمارا کیا فرض ہوگا؟'' حضرت عباسؑ نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی سپاہی اپنے کمانڈر سے احکامات حاصل کرتا ہے۔

''بیٹا! اس وقت تمہارا فرض ہوگا کہ تم فرزند رسولؐ اور ان کے اہل بیتؑ پر اپنی جان قربان کر دو۔'' حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا۔

اس حکم کو حضرت عباس علیہ السلام نے ہمیشہ کے لئے اپنے دل پر نقش کرلیا۔ پھر جب سن اکسٹھ ہجری میں واقعہ کربلا پیش آیا تو آپ نے اپنی، اپنے تینوں بھائیوں اور دو بیٹوں جناب فضلؑ اور جناب قاسمؑ کی جانیں اللہ کی راہ میں اس بہادری کے ساتھ قربان کیں کہ آپ کا نام رہتی دنیا تک کے لئے صبر، برداشت، وفاداری، جان نثاری بہادری اور عزم و ہمت کی مثال بن کر رہ گیا۔

☆☆☆

روایات میں ہے کہ قیامت کے دن جب ساری مخلوق سخت پریشان ہوگی اس وقت اللہ کے رسولؐ، حضرت علی علیہ السلام کو جناب فاطمہؑ کے پاس بھیج کر یہ معلوم کرائیں گے کہ آج کے دن کے لئے تمہارے پاس کیا چیز ہے جس کے ذریعے امت کو بخشوایا جاسکے۔

اس وقت جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا امیرالمومنینؑ سے کہیں گی۔ ''ابوالحسنؑ! آج کے دن امت کو بخشوانے کے لئے میرے پاس میرے بیٹے عباس کے دونوں کٹے ہوئے ہاتھ ہی کافی ہیں۔''

☆☆☆☆☆

شبیہ پیغمبرؐ

اس وقت حضرت علی اکبرؑ کی عمر سترہ سال کے قریب تھی لیکن حاکم شام کی دوربین نگاہیں انہیں آنے والے زمانے میں حسین ابن علیؑ کے حریف کے طور پر دیکھ رہی تھیں اور اسی مقصد کے لیے بنو اُمیہ کے درباری شاعر حضرت علی اکبرؑ کی شان میں قصیدے لکھ رہے تھے۔

*****

سورج کی تیز دھوپ نے سارے میدان کو تنور کی طرح گرم کر رکھا تھا۔ میدان کربلا کی ریت شہیدوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ گھوڑوں کے دوڑنے سے گرد و غبار کا ایک بادل سارے میدان پر پھیلا ہوا تھا۔ حسین علیہ السلام کے ساتھی ایک ایک کر کے کم ہوتے جا رہے تھے۔ یزیدی لشکر کی تعداد کوفے سے مسلسل آنے والے فوجیوں کی وجہ سے بڑھتی جا رہی تھی۔ خیمہ حسینیؑ میں ایک کہرام بپا تھا۔ اصحاب حسینؑ کی خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں ایک خیمے میں برابر برابر رکھی تھیں۔ ان لاشوں کو حسین علیہ السلام خود میدان جنگ سے اٹھا کر لائے تھے تا کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے عظیم انسانوں کی لاشیں یزیدی فوج کے گھوڑوں کے سموں سے پامال نہ ہو جائیں۔ تین دن کی بھوک پیاس اور راتوں کو جاگنے کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام کا چہرہ مبارک زرد ہو رہا تھا۔ داڑھی کے بال بے ترتیب تھے۔ لباس پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ سیاہ عمامے پر میدان کربلا کی

خاک جمی ہوئی تھی۔

خیمہ حسینیؑ میں عورتیں اور بچے سہمے ہوئے تھے۔ بھوک پیاس اور خوف کے مارے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ کبھی ایک خیمے میں جا کر بچوں کو سنبھالتیں کبھی دوسرے خیمے میں جا کر عورتوں اور بچوں کو تسلی دیتیں۔ بی بی ام ربابؓ اپنے چھ ماہ کے بچے علی اصغرؑ کو گود میں لے کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ علی اصغرؑ کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے اور ان کا جسم بار بار عجیب طرح اینٹھ رہا تھا۔ ام ربابؓ اپنے بچے کی بھوک پیاس دیکھتیں تو بے بسی سے آنسو بہانے لگتیں۔ امام حسین علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے علیؑ ابن الحسینؑ بخار کی شدت سے بے حال ایک خیمے میں پڑے تھے۔ جناب زینبؑ بار بار ان کے پاس جا کر بیٹھتیں، ان کے ماتھے کو چھو کر دیکھتیں اور حسرت سے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتیں کہ کاش کہیں تھوڑا سا پانی مل جائے گا کہ وہ اس میں کپڑا بھگو کر اپنے بھتیجے کے ماتھے پر رکھ سکیں۔

امام حسین علیہ السلام کے دوسرے بیٹے علی اکبرؑ کی ماں ام لیلیٰؓ کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ اپنے شریک حیات اور اپنے آقا و مولا حسین علیہ السلام کے مزاج کو جانتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اصحاب حسینؑ کی شہادت کے بعد رشتے داروں، آنکھ کے تاروں اور جان سے پیاروں کی باری آئے گی تو امام حسینؑ سب سے پہلے اپنے جوان بیٹے کو شہادت کے لئے اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں گے، اسی لئے جب سے بی بی فضہ نے اصحاب حسینؑ میں سے آخری جانثار کے قتل کی خبر خیمے میں آ کر سنائی تھی اس وقت سے بی بی ام لیلیٰؓ کا دل ان کے قابو ہی میں نہیں رہا تھا۔

☆☆☆☆

واقعہ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے تین بیٹے کربلا میں موجود تھے۔ حضرت علی ابن الحسینؑ جنہیں امام زین العابدینؑ اور سید سجادؑ بھی کہا جاتا ہے۔ امام سجادؑ کی والدہ جناب شہر بانو مدینے ہی میں انتقال فرما چکی تھیں۔ امام حسین علیہ السلام کی دوسری زوجہ ام رباب

امام علیہ السلام کے سب سے چھوٹے فرزند حضرت علی اصغرؑ اور بی بی سکینہؑ کی ماں تھیں۔ امام علی ابن الحسینؑ مشیت الٰہی کی وجہ سے کربلا میں زندہ رہے۔ حضرت علی اکبرؑ اور حضرت علی اصغرؑ نے جام شہادت نوش کیا۔

حضرت علی اکبرؑ گیارہ شعبان ۳۳ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ام لیلیٰؑ بنت ابی مرہ تھیں۔ جناب ام لیلیٰؑ شام کے حکمران معاویہ بن ابی سفیان کی بھانجی اور یزید کی پھوپھی زاد بہن لگتی تھیں۔ بنو امیہ اسی رشتے داری کی وجہ سے حضرت علی اکبرؑ کو اپنے سیاسی مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کے ان بیٹے کو ان کے ددھیالی خاندان بنی ہاشم کی جانب سے بددل کرکے ان کی ننھیال بنوامیہ کی طرف مائل کیا جائے۔

حضرت علی اکبرؑ ذرا بڑے ہوئے تو ان کے چہرے مہرے، چال ڈھال اور انداز گفتگو میں اپنے جد پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شباہت صاف نظر آنے لگی اور عرب کے بادشاہ گر طبقے کو حضرت علی اکبرؑ کی صورت میں اپنے ضرورت کے مطابق مستقبل کا ایک بہترین خلیفہ نظر آنے لگا۔

بنوامیہ کے پالیسی ساز جانتے تھے کہ عوام ان کے ظلم وستم، چالاکیوں اور سازشوں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گے۔ ایسے میں انہیں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بنی ہاشم جیسے اعلیٰ خاندان سے بھی تعلق رکھتا ہو اور بنوامیہ سے بھی اس کا کوئی رشتہ نکلتا ہو۔ اور ایسا شخص بنی ہاشم کے خاندان سے ہونے کے باوجود بنی امیہ کی حکومتی مشنری اور خفیہ ایجنسیوں کے ماتحت رہ کر وہی کام کرسکے جو بنی امیہ کرتے رہے ہیں۔

حضرت علی اکبرؑ کی والدہ بی بی ام لیلیٰؑ بادشاہ وقت کی بھانجی تھیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ حضرت علی اکبرؑ شکل وشباہت، چال ڈھال، قد وقامت میں اللہ کے رسولؐ کی تصویر تھے۔

حسین ابن علیؑ کو تنہا کرنے کے لئے یہ ایک دوررس منصوبہ تھا جس کے لئے بنوامیہ کی خفیہ ایجنسیوں نے علیؑ ابن الحسینؑ کا انتخاب کیا تھا۔ اسی لئے حکومت کے ذرائع ابلاغ

نے حضرت علی اکبرؑ کی شخصیت کو بنی امیہ کے تعلق سے ابھارنے کے لئے حضرت علی اکبرؑ کے لڑکپن ہی سے کام شروع کر دیا گیا تھا۔

حکومت کے دستر خوان سے غلاظت کھانے والے شاعروں، ادیبوں اور راویوں نے حضرت علی اکبرؑ کی شان میں قصیدے کہنا شروع کر دیے تھے۔ ان اشعار میں ان کی ددھیال یعنی بنی ہاشم، حضرت علی علیہ السلام، جناب فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ حتی کہ رسول اللہؐ تک کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کی ننھیال، بنی امیہ کے ناموں اور کارناموں کو بیان کیا جاتا اور اسی حوالے سے حضرت علی اکبرؑ کی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی۔ مثلاً اسی طرح کے ایک قصیدے کا آخری شعر ہے۔

''میرا اشارہ لیلیٰ کے بیٹے کی طرف ہے جو بڑی بخشش کرنے والے ہیں۔ وہ جو عظیم حسب ونسب والی خاتون کے فرزند ہیں۔''

جس زمانے میں شام کی حکومت خلیفہ رسول حضرت حسنؑ ابن علیؑ کے خلاف فوجی مہم جوئی میں مصروف تھی۔ اس کے مسلح دستوں نے حجاز کے سرحدی علاقوں میں کشت وخون کا بازار گرم کر رکھا تھا اور اس کے خفیہ ایجنٹ امام حسنؑ کی شکستہ دل فوج میں بددلی پھیلا رہے تھے اس زمانے میں ایک دن حاکم شام نے اپنے درباریوں سے سوال کیا۔ ''تمہارے خیال میں خلافت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟''

خوشامدیوں نے یک زبان ہو کر کہا: ''آپ! یا امیر المومنین۔''

امیر شام مسکرائے اور بولے: ''خلافت کے حق دار سب سے زیادہ حسینؑ ابن علیؑ کے فرزند علیؑ ہیں جن کے دادا اللہ کے رسولؐ ہیں اور ان میں بنی ہاشم کی شجاعت، بنی امیہ کی سخاوت اور قبیلہ ثقیف کی خودداری پائی جاتی ہے۔''

اس وقت حضرت علی اکبرؑ کی عمر سترہ سال کے قریب تھی۔ لیکن حاکم شام کی دوربین نگاہیں انہیں آنے والے زمانے میں حسینؑ ابن علیؑ کے حریف کے طور پر دیکھ رہی تھیں اور اسی مقصد کے لیے بنوامیہ کے درباری شاعر حضرت علی اکبرؑ کی شان میں قصیدے لکھ رہے تھے۔

☆☆☆

اہل حرم کے خیموں کے پچھلے حصے کی طرف ایک خندق کھود کر اس میں آگ جلائی جارہی تھی۔ یہ خندق حضرت امام حسین علیہ السلام کے حکم کے مطابق جنگ شروع ہونے سے پہلے اصحاب حسینؑ نے کھودی تھی تاکہ خواتین اور بچوں کے خیمے دشمن کے حملے سے محفوظ رہیں۔ یزیدی فوج سے ہر کام کی توقع کی جاسکتی تھی۔ ایک یزیدی دستہ خیمے کے عقب سے حملہ کرنے آیا بھی تھا لیکن آگ کی خندق دیکھ کر لوٹ گیا تھا۔ سامنے کی طرف امام حسین علیہ السلام اور ان کے جاں نثار اہل حرم کے خیموں کی حفاظت کے لئے موجود تھے۔ ان کے جیتے جی کسی شخص کی مجال نہیں تھی کہ رسولؐ زادیوں کے خیموں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

خندق کی آگ، سورج کی تپش، میدان کربلا کی گرمی اور بے پناہ ہجوم کی وجہ سے حبس کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ خاص طور پر خیموں میں موجود عورتوں اور بچوں کے لئے سانس لینا مشکل ہورہا تھا۔ ایسے میں گھر کی وفادار کنیز فضہ نے خیمے کا پردہ اٹھایا تاکہ خیمے کا حبس کسی قدر کم ہوسکے۔

خیمے سے تھوڑے سے فاصلے پر امام حسین علیہ السلام اپنے بیٹے علی اکبرؑ کے ساتھ کھڑے تھے۔ فضہ ذرا آگے بڑھ گئیں تو انہوں نے سنا کہ علی اکبرؑ اپنے بابا سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں، امام حسینؑ انہیں کوئی جواب نہیں دیتے بس خاموش کھڑے علی اکبرؑ کے چہرے کو دیکھے جارہے ہیں۔ فضہ اپنی جگہ سے پلٹیں اور دوڑتے قدموں سے خیمے میں داخل ہوئیں۔

''فضہ..... فضہ! کیا ہوا؟'' ام لیلٰیؑ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوگئیں۔

''اماں فضہ! بھائی تو خیریت سے ہیں؟'' جناب زینبؑ نے فضہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں جھنجھوڑا۔

''شہزادی! علی اکبرؑ آقا حسینؑ سے جہاد کی اجازت طلب کررہے ہیں اور میرے آقا

"بس خاموش کھڑے ان کا چہرہ دیکھے جارہے ہیں۔" فضہ نے جناب زینبؑ کو گلے سے لگاتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

فضہ کی باتیں سن کر ام لیلیٰؑ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کا دل اپنے بیٹے کے لئے تڑپ رہا تھا لیکن وہ اس خاندان کی بہو تھیں۔ وہ رسولؐ کی نواسیوں کے سامنے اپنے صدمے اور بے تابی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔ بی بی زینبؑ نے علی اکبرؑ کو اپنی گود میں پالا تھا اور اپنے بچوں سے زیادہ انہیں چاہتی تھیں۔ وہ اپنی بھاوج کے دکھ کو بھی محسوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر جناب ام لیلیٰ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

یزیدی لشکر میں ڈھول، تاشے اور نفیریاں بج رہی تھیں۔ شامی درندے نواسہ رسولؐ کو قتل کرنے کو بیتاب تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر بیٹھے اپنے نیزے اور کمانیں ہوا میں اچھال اچھال کر وحشیانہ نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے گھوڑں کے دوڑنے سے ہر طرف گرد و غبار کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ امام حسین علیہ السلام اپنے خیموں کے سامنے اپنے بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور اپنے بیٹے علی اکبرؑ کے ساتھ کھڑے تھے۔ حضرت علی اکبرؑ نے اپنے بابا سے میدان جنگ کی اجازت طلب کی تو حضرت ابوالفضل عباسؑ، ان کے بھائی، امام حسنؑ کے بیٹے، مسلم بن عقیلؑ کے بھائی، عبداللہ بن جعفرؑ کے فرزند بھی موجود تھے اور یہ سب کے سب امام حسینؑ کے فرزند علی اکبرؑ سے پہلے شہید ہونے کے لئے بیتاب تھے لیکن امام حسین علیہ السلام نے ان سب سے پہلے اپنے پیارے بیٹے علی اکبرؑ کو میدان جنگ میں جانے کی اجازت دی۔ امام حسینؑ دنیا کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اللہ کی راہ میں قربانی پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے تو سب سے پہلے اپنے عزیز ترین فرد ہی کو اللہ کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کرنا چاہیے۔

علی اکبرؑ میدان جنگ میں جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہونے لگے تو امام حسین علیہ السلام خود ان کے گھوڑے کی لگام تھام کر کھڑے ہوگئے۔ یہ دیکھ کر حضرت علی اکبرؑ کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ آپؑ نے اپنے بابا کے قدموں میں سر جھکا دیا۔ امام حسینؑ نے انہیں سینے سے لگا کر پیار کیا۔ حضرت علی اکبرؑ رکابوں میں پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہونے کو آگے بڑھے تو امام حسین علیہ السلام نے ان کا بازو تھام لیا۔ ''بیٹا! خیمے میں جاکر اپنی ماں اور پھوپھی سے تو اجازت لے لو۔'' آپؑ نے اپنے بہادر بیٹے کے گھوڑے کی لگام کو تھامتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا جان!'' حضرت علی اکبرؑ نے فرماں برداری سے سر جھکایا اور خیموں کی طرف بڑھنے لگے۔ خیموں کے قریب پہنچے تو انہیں اپنی پھوپھی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ پھوپھی زینبؑ ہی نے تو انہیں گود میں پالا تھا۔ اماں کو تو سارا سارا دن پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ اکبر کہاں ہیں۔ وہ تو سارا دن پھوپھی زینبؑ ہی کے ساتھ رہتے تھے۔

علی اکبرؑ نے آگے بڑھ کر خیمے کا پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوگئے۔ پھوپھی زینبؑ، چھوٹی بہن سکینہؑ اور ان کی ماں ام لیلیٰؑ خیمے کے پردے سے لگی کھڑی تھیں۔ بی بی زینبؑ ان کی بلائیں لے کر بولیں: ''اکبر! میدان جنگ میں جارہے ہو بیٹا! کاش تمہارے سارے زخم پھوپھی کے لگتے میری جان۔ کاش تمہاری ساری بلائیں پھوپھی اپنے سر لے سکتی....''

''ام لیلیٰؑ خاموش کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اکبرؑ نے ان کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا۔'' اماں جان بابا نے کہا ہے کہ پہلے آپ سے اجازت طلب کروں۔ آپ اجازت دے رہی ہیں ناں اپنے بیٹے کو کہ وہ امام وقتؑ کے قدموں میں اپنی جان نچھاور کردے.... اماں جان! اجازت ہے ناں!'' ماں کو خاموشی سے آنسو بہاتے دیکھ کر بہادر بیٹے نے ماں کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''بیٹا! تمہیں تو زینبؑ نے پالا ہے۔ میں تو صرف دودھ پلانے والی دایہ تھی تمہاری۔

ماں تو تمہاری زینبؑ ہے۔ جب اس نے تمہیں اجازت دے دی تو پھر میں کون ہوتی ہوں۔'' ام لیلیٰؑ پہلی بار بولیں۔

''نہیں اماں! پھوپھی جان میری پھوپھی ہیں اور آپ.... آپ میری ماں ہیں۔'' اکبر نے اپنی ماں کے شانے پر سر رکھ کر پیار سے کہا۔

اسی وقت باہر کی جانب یزیدی فوج کے نعروں کی آواز آئی اور کئی تیر ایک ساتھ آ کر خیمے کی بیرونی دیوار میں پیوست ہو گئے۔ عورتوں نے دوڑ کر جلدی جلدی اس طرف سے بچوں کو ہٹانا شروع کیا۔ یزیدی فوجیوں کے طنز آمیز جملے سن کر حضرت علی اکبرؑ کے چہرے پر غیظ وغضب نظر آنے لگا۔

''بس بیٹا! اب سدھارو۔ ایسا نہ ہو کہ تم سے پہلے کوئی اور جوان شہید ہو جائے۔ میں نے تمہیں اجازت دی میرے لعل!.... بس میرا ایک کام کرنا بیٹا! جنت میں جا کر اپنے دادا علیؑ اور دادی فاطمہؑ سے میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ ان کی بہو اپنے میکے سے سارے رشتے توڑ کر آئی تھی۔ میرے میکے والوں کے پاس ساری دنیا کی بھی بادشاہت ہو تو میں اسے اپنا آقا و مولا امام حسینؑ کے جوتوں کی خاک سے بھی کمتر سمجھتی ہوں۔ تم سے ہزار بیٹے بھی ہوتے تو میں انہیں سیدہؑ کے لعل پر قربان کر دیتی۔'' بولتے بولتے ام لیلیٰؑ کی آواز بھرا گئی۔ بی بی زینبؑ نے آگے بڑھ کر انہیں اپنی بانہوں میں لے لیا اور علی اکبرؑ اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھے تیزی سے خیمے سے باہر نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

نواسۂ رسول حضرت امام حسینؑ بنی ہاشم کے جوانوں کے درمیان ابھی تک علی اکبرؑ کے گھوڑے کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ علی اکبرؑ نے اپنے بابا کے قدموں میں سر جھکا کر گھوڑے کی کمر پر ہاتھ رکھا اور رکاب میں پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ امام حسینؑ نے ''یا علی مددؑ'' کہا اور گھوڑے کی باگیں ان کے ہاتھ میں تھما دیں۔ اکبر نے نیام سے اپنی تلوار نکال کر ہوا میں بلند کی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

گھوڑا میدان جنگ کی طرف دوڑنے لگا تو امام حسینؑ بے اختیار ہو کر چند قدم ان کے گھوڑے کے پیچھے دوڑے۔ ''علی اکبر... علی اکبر... اے شبیہ پیغمبرؐ! ایک بار... بس آخری بار ایک مرتبہ اپنی شکل دکھا دو...'' امام حسینؑ نے فریاد کی۔

امام حسینؑ دوڑے تو حضرت ابوالفضل عباسؑ، قاسمؑ، عونؑ و محمدؑ، مسلم بن عقیلؑ کے بھائی اور امیر المومنینؑ کے بیٹے سبھی دوڑنے لگے تھے۔ حضرت عباسؑ نے بھائی کو سنبھالا ہوا تھا۔

اکبر نے اپنے بابا کی درد بھری آواز سن لی تھی۔ انہوں نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں۔ پلٹ کر بابا کے قریب آئے اور گھوڑے سے اتر کر اپنے بابا سے لپٹ گئے۔ امام حسینؑ نے ان کے چاند سے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر ان کی پیشانی کو چوما اور درود پڑھ کر کہا۔ ''جاؤ بیٹا جاؤ اللہ تمہاری قربانی کو قبول فرمائے۔''

علم دار لشکر حسینیؑ حضرت ابوالفضل عباسؑ نے آگے بڑھ کر اپنے بھتیجے کو سینے سے لگایا۔ ان کی کمر کو تھپکی دی۔ ''اکبر بیٹا! جنت میں جا کر میرے بابا سے کہہ دینا کہ آقا نے اپنے غلام کو اجازت نہیں دی ورنہ سب سے پہلے یہ غلام ہی اپنی جان قربان کرتا۔''

علی اکبرؑ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ کی طرف بڑھے تو امام حسینؑ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کیا۔ ''اے اللہ! گواہ رہنا کہ اب میں اس جوان کو تیرے دشمنوں سے جنگ کے لئے بھیج رہا ہوں جو صورت، سیرت، چال ڈھال، رفتار و گفتار اور اخلاق و عادات میں سب سے زیادہ تیرے رسولؐ کی شبیہ ہے۔ ہم جب بھی تیرے رسولؐ کی زیارت کو بے تاب ہوتے تو اس جوان کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اے اللہ اس قوم کو زمین کی برکتوں سے محروم کر کے ان کی طاقت توڑ دے کہ اس کے سرداروں نے ہمیں خط لکھ کر بلایا اور اب وہ ہمارے ہی خلاف تلوار اٹھائے کھڑے ہیں تاکہ ہمیں قتل کر دیں۔''

بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کرنے کے بعد آپ نے لشکر یزید کے سالار عمر ابن سعد کو

مخاطب کر کے کہا: ''عمر سعد! اللہ تیری نسل کو ختم کر دے۔ تیرے کسی کام میں برکت نہ ہو اور اللہ میرے بعد تجھ پر ایسے شخص کو مسلط کر دے جو تیرے بستر پر تیرا سر کاٹ ڈالے کہ تو نے تو رسول اللہؐ سے میری رشتے داری تک کا لحاظ نہیں کیا۔'' اس کے بعد آپؑ نے سورۃ آل عمران کی ایک آیت تلاوت فرمائی۔

''بے شک اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندان ابراہیمؑ اور خاندان عمرانؑ کو سارے جہاں سے زیادہ عزت و بزرگی عطا فرمائی ہے۔ بعض کی اولاد کو بعض سے اور اللہ (سب کی) سنتا ہے اور (سب کچھ) جانتا ہے۔'' (آیت ۳۲)

قرآن مجید کی یہ آیت کائنات کی تمام مخلوق پر اللہ کے رسولؐ اور ان کے اہل بیتؑ کی عظمت و بزرگی کا کھلا ثبوت ہے اور اس وقت اس آیت کی تلاوت کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس آیت کے الفاظ یزیدی فوج میں شامل کسی مسلمان کے کانوں تک پہنچ جائیں۔ شاید کسی کا ضمیر زندہ ہو جائے، شاید ان میں سے کوئی مسلمان جہنم کی آگ میں جلنے سے بچ جائے'۔

لیکن یزیدی فوج تو انسانی شکل والے درندوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ شامی درندے وہی بچے تھے جنہوں نے طائف کی گلیوں میں اللہ کے پیغام کا مذاق اڑایا تھا جنہوں نے پتھر مار مار کر اللہ کے رسولؐ کو خون میں نہلا دیا تھا۔ سفاک درندوں کے یہ بچے اب بڑے ہو گئے تھے اور آج نواسۂ رسولؐ کو خون میں نہلانے کو بے تاب تھے۔

☆☆☆

یزیدی فوجوں کی صفوں کے سامنے جا کر علی اکبرؑ نے اپنے گھوڑے کی باگوں کو کھینچا۔ گھوڑا اگلے پاؤں اٹھا کر زمین پر مارنے لگا۔ علی اکبرؑ نے گرجتی ہوئی آواز میں یزیدی فوج کو مخاطب کیا۔

''میں علی ہوں۔ حسین ابن علیؑ کا بیٹا۔ خدا کی قسم اللہ کے رسولؐ کے

سب سے قریبی رشتے دار (بنی امیہ نہیں) ہم ہیں۔ میں اپنے
نیزے سے تمہیں اس وقت تک زخم لگاتا رہوں گا جب تک کہ میرا
نیزہ ٹوٹ نہ جائے۔ نواسۂ رسولؐ کو بچانے کے لئے میں تم پر اپنی
تلوار چلاؤں گا جیسی تلوار بنی ہاشم میدان جنگ میں چلاتے ہیں۔
خدا کی قسم ابن زیاد جیسے (بدکردار اور حقیر انسان) ہم پر حکومت نہیں
کرسکتے۔''

حضرت علی اکبرؑ نے یہ کہہ کر کہ اللہ کے رسولؐ کے سب سے قریبی رشتے دار ہم ہیں شامی حکومت کے بیس برس کے جھوٹے پروپیگنڈے کی پول کھول دی تھی۔ شام کی حکومت نے جذباتی اور جاہل انسانوں کی بڑی بڑی فوجیں اسی جھوٹ کے بل بوتے پر تو جمع کی تھیں۔ شام کے رہنے والے مسلمان سرکاری مسجدوں کے تنخواہ دار خطیبوں کی تقریریں سن سن کر بڑے ہوئے تھے۔ اسی لئے وہ بنوامیہ ہی کو رسول اللہؐ کا قرابت دار سمجھتے تھے۔ ایسے میں یزیدی لشکر کے سردار سچائی کا مقابلہ کس طرح کرسکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ علیؑ ابن الحسینؑ یزیدی حکومت کی سازشوں کا پردہ مزید چاک کرتے یزیدی سرداروں نے تلواریں کھینچ لیں اور اپنے وحشی سپاہیوں کو علی اکبرؑ پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

سینکڑوں گھوڑے ہنہنا کر آگے بڑھے، ہزاروں تلواریں بلند ہوئیں، نیزہ بازوں نے اپنے نیزے سیدھے کیے، تیر اندازوں نے تیروں کو کمان میں رکھ کر چلایا اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔

حضرت علی اکبرؑ کا گھوڑا بجلی کی طرح اپنی جگہ بدل رہا تھا۔ علیؑ کے پوتے کی تلوار موت بن کر یزیدیوں کی صفوں پر گر رہی تھی جو سامنے آتا وہ گھائل ہو کر زمین پر جا گرتا۔ اکبرؑ تین دن کے بھوکے پیاسے تھے۔ یزیدی درندے تازہ دم تھے لیکن اکبرؑ اپنی جنگی مہارت، بہادری، اور بے خوفی کی وجہ سے شیر بن کر حملے کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کو دہلا دینے والے نعروں اور بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے کی وجہ سے یزیدی فوجوں کی صفیں درہم برہم ہوتی

جارہی تھیں۔ یزیدی فوجیوں کا اعتماد دم توڑ رہا تھا۔ اکثر فوجی اب اکبرؑ کے سامنے آنے سے کترا رہے تھے۔ ایک اکیلے نوجوان نے یزید کی منظم اور تازہ دم فوج کو ٹکڑوں میں منتشر کر دیا تھا۔

صحرا کے وحشی درندے ذرا دیر کو ادھر ادھر منتشر ہو کر بھاگے تو اکبرؑ کا حلق پیاس سے خشک ہونے لگا۔ جسم کا رہا سہا پانی پسینہ بن کر بہہ چکا تھا۔ پیاس کی شدت اتنی بڑھی کہ علی اکبرؑ اپنا گھوڑا دوڑا کر میدان کے دوسری طرف بیٹے کی جنگ کا نظارہ کرنے والے اپنے بابا کے قریب پہنچ گئے۔ ''بابا! پیاس سے جسم کی جان نکلتی محسوس ہو رہی ہے۔ زرہ کی کڑیاں دھوپ میں سلگ رہی ہیں۔ تلوار کا دستہ آگ کی طرح تپ رہا ہے....'' اکبرؑ نے بے اختیار کہا اور پھر بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔ ذرا دیر رک کر جھجکتے جھجکتے دوبارہ امام علیہ السلام سے عرض کیا۔ ''بابا!....اگر ایک گھونٹ پانی مل جاتا.....''

دنیا کی ساری نہریں، دریا، جھاگ اڑاتے بیکراں سمندر حسینؑ ابن علیؑ کی ماں فاطمہؑ بنت محمدؐ کے مہر کا حصہ تھے لیکن دنیا کے سارے پانی، تمام دریاؤں، نہروں، ندیوں، چشموں اور سمندروں کا مالک اس وقت پانی کا ایک گھونٹ بھی اپنے تین روز کے پیاسے بیٹے کو نہیں پلا سکتا تھا۔ علی اکبرؑ کی فرمائش سن کر امام حسینؑ نے سر جھکا لیا۔ ان کے دل کا لہو ان کی بے خواب سرخ آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکا اور کربلا کی ریت میں جذب ہو گیا۔ پھر آپ نے سر اٹھایا، اپنے پیاسے بیٹے کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ ''میری جان میری آنکھوں کے تارے! میرے دل کے ٹکڑے! بس ذرا دیر اور جنگ کرو۔ بہت جلد تم اپنے جد رسول اللہؐ کی زیارت کرنے والے ہو۔ رسول اللہؐ جنت میں اس طرح سیراب کریں گے کہ پھر پیاس تمہیں کبھی پریشان نہیں کرے گی۔'' امام حسینؑ نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ پھر فرمایا: ''علی اکبر! یوں کرو کہ اپنی زبان میرے منہ میں دے دو۔ شاید میرے منہ کی نمی سے تمہاری پیاس ذرا کم ہو جائے۔''

اکبرؑ نے اپنا بابا کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھے اور فوراً الگ کر لیے۔ ان کا اپنا دل پھٹنے

لگا۔ ''بابا! آپ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ خشک ہے۔'' اکبرؑ نے درد وغم کے ساتھ بابا کے چہرے کو دیکھا۔

''اچھا بیٹا! یہ لو... یہ میری انگوٹھی اپنے منہ میں رکھ لو۔'' امام علیہ السلام نے اپنی عقیق سرخ کی انگوٹھی اکبرؑ کے منہ میں رکھ دی اور ان کے شانے کو تھپتھپا کر بولے۔ ''علی اکبر جاؤ میدان جنگ کی طرف لوٹ جاؤ۔ رسول اللہؐ بہت جلد تمہاری پیاس بجھائیں گے۔''

اکبرؑ گھوڑے پر سوار ہوئے اور اسے دوڑاتے ہوئے یزیدی فوج کی طرف بڑھے۔ لشکر یزید دوبارہ منظم ہو گیا تھا۔ اکبرؑ نے ان کے سامنے جا کر گھوڑے کو روکا اور گرج دار آواز میں بولے: ''بہادروں کی خوبیاں میدان جنگ ہی میں سامنے آتی ہیں اور کسی دعوے کے صحیح ہونے کا پتہ جنگ کے بعد ہی چلتا ہے۔ عرش عظیم کے مالک کی قسم میں تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم تلواریں اپنے نیام میں نہ رکھ لو۔''

یزیدی لشکر کو علی اکبرؑ کے انداز جنگ، مہارت اور چابک دستی کا اندازہ ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے حسینؑ کے بہادر بیٹے کو گھیر کر قتل کرنے کا نیا منصوبہ بنا رکھا تھا لیکن انہیں حضرت اکبرؑ پر وار کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ پہلے حملے میں ۸۰ یزیدی علی اکبرؑ کی تلوار کا شکار بنے تھے۔ دوسری بار جب آپ نے بھرپور حملہ کیا تو یزیدی فوج کی صفیں الٹ دیں۔ اس حملے میں بہت سے فوجی مارے گئے۔ آخر مرہ بن منقذ عبدی نے جو لشکر یزید کا ایک آزمودہ سپاہی تھا، اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر اب یہ جوان میرے قریب سے گزرا اور میں نے اس کے باپ کو اس کے غم میں نہ رلایا تو سارے عرب کے گناہوں کا بوجھ میری گردن پر ہے۔

جنگ کے دوران وہ موقع کی تاک میں رہا۔ ایک دفعہ جب حضرت علی اکبرؑ گھوڑا دوڑاتے اس کے قریب سے گزرے تو اس نے اپنی برچھی پورے طاقت سے شبیہ پیغمبرؐ کے سینے پر ماری۔ برچھی کی نوک سینے میں داخل ہوئی تو گھوڑے کی باگیں علی اکبرؑ کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور آپؑ نے بے اختیار گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے۔

گھوڑے کی آنکھوں میں خون بھر گیا تھا، وہ بدحواس ہو کر یزیدی فوج کے دستوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ خون کے پیاسے ہر طرف سے شبیہ پیغمبرؐ پر تلواریں برسانے لگے۔ آپؑ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ سر، گردن، کمر اور سینے سے خون کے فوارے پھوٹنے لگے اور ایک دفعہ گھوڑا کسی نیزے کے وار سے اچھلا تو آپؑ گھوڑے سے زمین پر گر گئے، گرتے گرتے آواز دی۔ ''یا ابتاہ ادرکنی۔ بابا جان میری مدد کو آئیے۔''

یہ آواز امام مظلومؑ کے کانوں تک پہنچی تو آپؑ نے اپنی کمر کو مضبوطی سے تھام لیا۔ حضرت عباسؑ نے آ کر اپنے آقا کو سنبھالا۔ امام علیہ السلام ذوالفقار زمین پر ٹیک کر بہ مشکل کھڑے ہوئے اور میدان جنگ کی طرف دوڑنے لگے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا راستہ بہ مشکل نظر آتا تھا اور آپؑ ''علی اکبر... علی اکبرؑ'' پکارتے جاتے تھے۔ بنی ہاشم کے سارے جوان تلواریں ہاتھوں میں لیے ان کے ساتھ ساتھ تھے۔

یزیدی فوج کے درندوں نے اتنے بہادروں کو ایک ساتھ آتے دیکھا تو وہ پیچھے کی طرف ہٹنے لگے۔ امام مظلومؑ اپنے جوان بیٹے کے قریب پہنچے تو علی اکبرؑ نے اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا: ''السلام علیک یا ابتاہ۔ بابا! آپ کو میرا سلام ہو۔ بابا! یہ دیکھیے رسولؐ خدا مجھے لینے کو آئے ہیں۔ بابا! نانا جانؐ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور فرماتے ہیں ہمارے پاس آنے کی جلدی کرو۔''

☆☆☆☆☆

حسنؑ کا چراغ

بڑے ہوئے تو جناب قاسمؑ کو معلوم ہوگیا کہ وہ حجرہ جس میں رسول خداؐ آسودہ خواب تھے بی بی عائشہؓ کو رسول اللہؐ کی وراثت میں ملا تھا۔ وہی وراثت جسے جب جناب فاطمہ زہراؑ نے حاصل کرنا چاہا تو حکمرانوں نے کہا تھا کہ رسولؐ اور پیغمبر اپنی وراثت نہیں چھوڑا کرتے۔

—*****—

رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا۔ آسمان گرد وغبار سے اٹا ہوا تھا۔ نویں محرم کا زرد چاند گرد وغبار کے بادلوں میں چھپا ہوا اس طرح چمک رہا تھا جیسے دھندلے شیشے کے پیچھے کوئی چراغ روشن ہو۔ دھندلی چاندنی میدان کربلا میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ صحرا کے آخری کنارے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ فضا میں سناٹا تھا۔ بس کبھی کبھار کسی جانور کے بولنے کی آواز اس سناٹے کو توڑتی اور صحرائی ہوا کی گونج میں کہیں کھو جاتی۔ میدان کا بہت بڑا حصہ فوجی دستوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس فوج کے سامنے میدان کے دوسرے حصے میں کچھ خیمے نظر آرہے تھے۔ ان مختصر خیموں کو ایک دوسرے کے قریب قریب لگایا گیا تھا تاکہ دشمن رات کے اندھیرے میں کسی تنہا خیمے پر حملہ آور نہ ہو جائے۔

انہی خیموں میں سے ایک خیمے کے اندر اس وقت ایک شمع روشن تھی۔ شمع کی روشنی ایک ماں اور اس کے بچوں کے چہروں کو روشن کر رہی تھی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے بڑے نواسے حسنؑ ابن علیؑ کی بیوہ ام فروہؓ کا خیمہ تھا۔ ام فروہؓ اپنے بچوں کو ساتھ لیے بیٹھی تھیں اور انہیں آنے والے دن کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ یہ بچے جن کی عمریں دس سے پندرہ برس کے درمیان تھیں امام حسن علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ امام حسنؑ کے سب سے بڑے بیٹے حسن مثنیٰ تھے اور سب سے چھوٹے بیٹے کا نام عبداللہ ابنِ حسنؑ تھا۔ منجھلے صاحبزادے کا نام قاسم تھا۔ قاسم ابن حسنؑ اپنی ماں کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔

☆☆☆

قاسم ابھی دو برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہیں یتیمی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ وہ رات اور اس رات کے آخری پہر میں بابا کی درد بھری آواز، پھر سارے خاندان کا ان کے گھر جمع ہو جانا۔ ایک بھیانک خواب کی طرح ان کے دماغ کے کسی گوشے میں موجود تھا۔ اپنی ماں اور پھوپھیوں کے دل دوز بین ان کی یادوں میں آج بھی اکثر گونجتے تھے۔ پھر صبح صبح جب پھوپھی زینبؑ انہیں گود میں اٹھا کر ان کے بابا کے پاس لے گئیں تو وہ منظر بھی انہیں ابھی تک نہیں بھولا تھا۔

سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ طاقچوں میں چراغ روشن تھے۔ ان چراغوں کی زرد روشنی میں انہوں نے اپنے بابا کو دیکھا۔ جن کا چہرہ کپاس کے پھول کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ بستر کے قریب ایک بڑا سا برتن رکھا تھا۔ کمرے میں خون کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پھوپھی زینبؑ نے انہیں ان کے بابا کے قریب لے جا کر گود سے اتارا تو قاسم نے اس برتن کو قریب سے دیکھا۔ اس برتن میں تازہ تازہ خون بھرا ہوا تھا۔

انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ برتن میں یہ خون کہاں سے آ گیا۔ پھوپھیوں کی سسکیاں اماں جان کے آنسو، چچا حسینؑ کا غم زدہ چہرہ، چچا عباسؑ کے چہرے پر غم و غصے کی کیفیت، یہ سب کچھ انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا انقلاب آ گیا۔ یہ سب کیوں ہو رہا تھا۔ یہ سب لوگ کیوں رو رہے ہیں؟ بابا کے قریب یہ خون کیسا ہے؟

لیکن جب ان کے بابا کراہتے ہوئے ذرا سے اٹھے اور چچا حسینؑ کے سہارے بستر

سے اٹھ کر بستر کے قریب رکھے ہوئے برتن پر جھکے اور ننھے قاسم نے اپنے بابا کے منہ سے خون کے لوتھڑے نکلتے ہوئے دیکھے تو ان کا معصوم سا ذہن بس اتنا سا سمجھ سکا کہ ان کے بابا کی زندگی خطرے میں ہے۔

قاسم کو وہ لمحہ بھی یاد تھا جب ان کے بابا نے انہیں قریب بلایا اور ایک تعویذ ان کے بازو پر باندھا تھا اور ان کے قریب کھڑے ہوئے ان کے چچا حسینؑ نے روتے روتے قاسم کو گود میں اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا تھا۔ اگلے دن چچا عباسؑ انہیں گود میں اٹھائے اٹھائے ان کے بابا حسنؑ کے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور مسجدِ نبویؐ کے قریب ان کے بابا کے تابوت پر تیروں کی بارش ہوئی تو چچا عباسؑ نے انہیں گود سے اتار کر اپنے پیچھے کھڑا کر لیا تھا.... یہ منظر قاسم کی یادوں میں ابھی تک تازہ تھا۔ پھر اس جنازے کو جنت البقیع کے قبرستان کی طرف لے جایا گیا تھا۔ قاسم کو اتنا یاد تھا کہ اس وقت بھی وہ چچا عباسؑ کی گود میں تھے۔

اس وقت تو یہ سب باتیں قاسم کی سمجھ میں نہیں آئیں لیکن وہ جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے ساری باتیں ان کی سمجھ میں آتی گئیں۔ اس رات ان کے بابا جان کو زہر دیا گیا تھا۔ ایسا زہر جس نے ان کے بابا جانؑ کے کلیجے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ یہ زہر کئی سو میل دور بیٹھے شام کے حکمران کے اشارے پر ایک بدنصیب اور لالچی عورت نے پانی کی صراحی میں ڈال دیا تھا۔ جنازے پر تیروں کی بارش بھی دشمنانِ اسلام نے کی تھی۔ چچا حسینؑ اپنے بھائی کو نانا رسول اللہؐ کی قبر کے برابر سپردِ خاک کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا کرنے سے تفرقہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ رسولؐ اللہ کی زوجہ حضرت عائشہؓ اس وقت اپنے عقیدت مندوں کو لے کر وہاں آ گئی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ رسول اللہؐ میرے حجرے میں دفن ہیں وہاں میں حسن کو دفن نہیں ہونے دوں گی۔ اس وقت تکرار ہوئی تو بی بی عائشہؓ کے ساتھیوں نے جنازے پر تیروں کی بارش کر دی تھی۔ کئی تیر امام حسنؑ کے تابوت میں بھی پیوست ہو گئے تھے۔

اس سب کے باوجود ان کے چچا حسینؑ نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بنی ہاشم کے جوانوں کو مشتعل نہیں ہونے دیا اور اپنے بھائی کو جنت البقیع کے قبرستان میں

لے جا کر اپنی ماں فاطمہ زہراؑ کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا۔

بڑے ہوئے تو جناب قاسمؑ کو معلوم ہو گیا کہ وہ حجرہ جس میں رسول خداؐ آسودہ خواب تھے بی بی عائشہؓ کو رسول اللہؐ کی وراثت میں ملا تھا۔ وہی وراثت جسے جب جناب فاطمہ زہراؑ نے حاصل کرنا چاہا تو حکمرانوں نے کہا تھا کہ انبیاؑ اپنی وراثت نہیں چھوڑا کرتے۔ جناب قاسم کو بعد میں یہ شرعی مسئلہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس حجرے میں رسول اللہؐ کی دوسری بیویوں کا بھی حصہ تھا اسی لیے اس حجرے میں حضرت عائشہ کا حصہ چند فٹ سے زیادہ نہیں بنتا تھا جس میں اُنہوں نے اپنے والد حضرت ابوبکرؓ کو قبر کی کشادہ جگہ فراہم کی تھی!

چچا حسینؑ اس ساری اشتعال انگیزی اور ناانصافی کو جانتے تھے لیکن ابھی خاموش تھے کہ ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ چچا حسینؑ دشمنوں کے سارے ظلم دیکھتے رہے تھے۔ تمام سازشوں کو جانتے تھے لیکن ایک خاص وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ نانا رسولؐ اللہ نے بھی تو اعلانِ توحید کے فوراً بعد اللہ کے گھر کو بتوں سے پاک کرنے کا کام نہیں کیا تھا۔ وہ اللہ کے اسی گھر میں آتے جاتے رہے جہاں لکڑی، مٹی اور پتھر کے تین سو ساٹھ بت پوجے جاتے تھے۔ اس خاص وقت سے پہلے وہ لوگوں کو ان بتوں کی پرستش سے روکتے تو رہے لیکن انہیں توڑنے کے لیے کوئی فوجی مہم روانہ نہیں کی لیکن جب وقت آ گیا تو مکے میں داخل ہو کر انہوں نے سب سے پہلے ان بتوں کو پاش پاش کر کے اللہ کے گھر کو ان بتوں کی نجاست سے پاک کیا تھا۔

چچا حسینؑ کے لیے تو نانا رسول اللہؐ بار بار کہہ چکے تھے کہ ''حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔'' اسی لیے حسینؑ اپنے نانا رسول اللہؐ کی طرح نئے دور کے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے ظلم و سفاکی، گمراہی و بے دینی کے بتوں کو پاش پاش کرنے کے لیے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن نئے دور کے ان طاقتور بتوں کو توڑنا اتنا آسان نہیں تھا کہ ان بتوں نے خود کو برگزیدہ ہستیوں کا رشتے دار ظاہر کر کے خود کو ان مقدس ہستیوں میں شامل کر لیا تھا۔ کفر و شرک کے یہ مجسمے موسیٰؑ کا روپ اختیار کر کے قوم موسیٰؑ کو دھوکا دے رہے

تھے۔ نئے دور کے یہ چلتے پھرتے بت عبائے ابراہیمؑ اوڑھ کر ملتِ ابراہیمؑ کو بت پرستی کے راستے کی طرف لے جا رہے تھے۔

حسینؑ وارثِ موسیٰؑ و ابراہیمؑ تھے لیکن ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ لوگوں کو حقیقت سمجھا سکیں۔ وہ لوگوں کو بتا سکیں کہ عبائے ابراہیمؑ کے اندر ابراہیم خلیلؑ اللہ نہیں، بلکہ نمرود ایک نئے روپ میں موجود ہے۔ عصائے موسیٰؑ اٹھانے والا موسیٰؑ کلیم اللہ نہیں، یہ نئے دور کا فرعون ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتے داری جتانے والے نوحؑ کی بیوی اور بیٹے کی طرح ہیں جو گمراہوں کے ساتھ طوفان نوحؑ میں غرق کر دیے گئے تھے۔

قاسم کے چچا حسینؑ ابن علیؑ ایک ایسا ہی طوفان نوح اٹھانے کی تیاری کر رہے تھے جس میں امتِ محمدیہ کے تمام منافقوں، تمام گمراہوں، تمام کاذبوں اور تمام دھوکے بازوں کو ڈبو کر نیست و نابود کر دیا جائے لیکن یہ طوفان نوح شہیدوں کے خون سے اٹھنا تھا اور اس کا آغاز اس مرتبہ شہر نجف کے تنور سے نہیں، دریائے فرات کے کنارے ایک ریتیلے میدان سے ہونا تھا۔

☆☆☆

سن ساٹھ ہجری میں آخر کار وہ وقت آ گیا۔ یزید کے باپ نے تقدس کی جو عبا اوڑھ رکھی تھی وہ یزید ابن معاویہ نے پہنی تو جگہ جگہ سے پھٹنے لگی تھی اور مسلمانوں کو عبا کے اندر مکروہ وجود کہیں کہیں سے صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ یزید ابن معاویہ کو خاندانی حکومت دولت اور طاقت پر بڑا بھروسا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کی نام نہاد مذہبی اداکاری سے تنگ آ گیا تھا۔ جو باتیں اس کے بزرگ کھل کر نہیں کہتے تھے وہ باتیں اس نے کھلے عام کہنا شروع کر دیں، جو ظلم اس کے بزرگ اسلامی شریعت کے لبادے میں چھپا کر کیا کرتے تھے یزید ان گناہوں کو ایام جاہلیت کے نام پر کھلے عام سرانجام دینے لگا۔

علی ابن ابی طالبؑ، حسنؑ ابن علیؑ اور خود حسینؑ جو بات برسوں سے مسلمانوں کو سمجھا رہے تھے اس کے ثبوت اب مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے نظر آنے لگے تھے۔

بیداری کے اس مختصر سے عرصے کو نواسۂ رسولؐ نے غنیمت جانا اور مدینے سے اپنی

تحریک نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کا آغاز کردیا۔ یہ تحریک مدینے سے مکے اور مکے سے کوفے تک پہنچی اور کربلا کے میدان میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

قاسمؑ ابن حسنؑ بچپن اور لڑکپن کی عمر گزار کر جوانی میں قدم رکھنے ہی والے تھے کہ سن ساٹھ ہجری ختم ہونے کو آیا۔ حسین علیہ السلام رجب کے مہینے کے آخر میں مدینے سے نکلے اور اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ تین شعبان کو مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ مکے میں یزیدی خفیہ ایجنسیوں کی سازش کو محسوس کرتے ہی امام حسینؑ نے مکے سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور حج سے ایک دن پہلے آپؑ کوفے کی طرف روانہ ہوگئے۔

حسینؑ لوحِ محفوظ پر لکھی ہوئی قسمت سے بھی واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ قسمت کا لکھا انسانوں کی کوشش، جدوجہد اور دعاؤں کے ذریعے تبدیل بھی ہوسکتا ہے۔ انہوں نے کسی غیر کو بھی آنے والے خطرات سے بے خبر نہیں رکھا تھا، گھر والے تو گھر والے تھے، خاندانِ رسالتؐ کے ایک ایک فرد کو معلوم تھا کہ ایک دن اسے اللہ کی راہ میں اپنی جان کی قربانی پیش کرنا ہے۔

یہ بات قاسمؑ ابن حسنؑ کو بھی معلوم تھی۔ باباحسنؑ نے اپنی شہادت سے پہلے ان کے بازو پر جو تعویذ باندھا تھا، وہ اب بھی ان کے بازو پر بندھا رہتا تھا۔ چچا عباسؑ اور بھائی اکبرؑ نے انہیں تلوار چلانے، تیر اندازی اور نیزوں کا مقابلہ کرنے اور دشمن کو اپنے رجز کی گھن گرج سے بدحواس کردینے کی بھرپور تربیت دی تھی۔ وہ بچپن سے یہی سنتے آرہے تھے کہ ہمیں اللہ کی راہ میں شہید تو ہونا ہے لیکن بہت سے دشمنانِ اسلام کو موت کی نیند سلا کر شہید ہونا ہے۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے اور اسلام کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا جذبہ قاسمؑ کے خون میں رچ بس گیا تھا۔

اب وہ بے چین تھے کہ کب وہ دن آئے اور وہ اپنے دادا علیؑ ابی طالبؑ، اپنے بابا حسنؑ ابن علیؑ کو شہید کرنے والے سازشیوں کو اپنی تلوار کے ذریعے جہنم واصل کریں۔

☆☆☆

گھوڑوں کے دوڑنے سے میدان کربلا کے آسمان پر گرد و غبار کی چادر تن گئی تھی۔ انسانوں کی کثرت اور گرم ہوا کی وجہ سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ ویران خیموں کے پردے تیز ہوا میں بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ خیمہ حسینی کے سامنے نواسہ رسولؐ کے کئی دوستوں اور عزیزوں کے لاشے تیز دھوپ میں خاک پر پڑے تھے۔ شبیہ پیغمبر علی اکبرؑ، عونؑ و محمدؑ اور اولادِ عقیلؑ کے بہادر تلواروں، نیزوں اور بھالوں کے زخم کھا کھا کر شہید ہو چکے تھے۔

قاسمؑ شہادت کے لیے بیتاب تھے۔ وہ کئی بار اپنے چچا، امام وقت حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے لیکن امام حسینؑ ان سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے۔ عونؑ و محمدؑ کی شہادت کے بعد جناب قاسمؑ سے برداشت نہ ہو سکا اور آپ روتے ہوئے اپنے چچا کے قریب پہنچے۔ ''چچا جان! اب مجھے اجازت دیجیے۔'' انہوں نے بہ مشکل کہا۔

امام حسینؑ نے ان کے چاند جیسے چہرے پر آنسوؤں کی قطاریں بہتے دیکھیں تو دل تڑپ کر رہ گیا۔ اس عمر کے بچے تو موت کے خوف سے ڈرا کرتے ہیں اور قاسم مرنے کی اجازت نہ ملنے پر آنسو بہا رہے تھے۔ امام حسینؑ کی آنکھوں میں ماضی کے دنوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ انہوں نے قاسمؑ کو سینے سے لگایا اور روتے روتے کہا۔ ''قاسم! تم میرے بھائی کی نشانی ہو....''

''چچا جان!....'' قاسم نے اپنے بازو سے تعویذ کھولتے ہوئے کہا۔ ''چچا جان! یہ دیکھ لیجیے یہ تعویذ آج اماں نے میرے بازو سے کھولا ہے''۔ امام حسینؑ نے تعویذ قاسم کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے کھولا اور اسے بوسہ دیتے ہوئے فرمایا۔

''بیٹا! مجھے اس تعویذ کا مضمون معلوم ہے۔ ہاں یہی وہ وقت ہے جس کے لیے بھائی حسن مجتبیٰؑ نے کہا تھا۔ جاؤ....اب تم بھی سدھارو....لیکن بیٹا پہلے خیمے میں جا کر اپنی ماں سے اجازت لے لو۔''

قاسمؑ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے لگا۔ ''چچا جان! اماں تو مجھے پہلے ہی اجازت دے چکی ہیں۔ اماں نے تو رات ہی کہہ دیا تھا کہ قاسم! اپنے چچا پر اپنی جان قربان

کرنے میں دیر نہ کرنا۔"

"مجھے معلوم ہے قاسم! لیکن پھر بھی میدانِ جہاد میں جانے سے پہلے اپنی ماں، پھوپھیوں اور بہنوں سے مل کر آ جاؤ۔" امامؑ عالی مقام نے فرمایا۔

☆☆☆

سیدانیوں کی آہ و بکا کی آوازوں میں قاسمؑ ابن الحسنؑ خیمے سے باہر نکلے۔ سیدھے اپنے چچا کے پاس پہنچے۔ "چچا جان اب اجازت ہے کہ آپؑ کے دشمنوں سے لڑ کر اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کروں؟"

امامؑ نے ان کے کھلتے ہوئے عمامے کو دوبارہ درست کر کے باندھا۔ عمامے کے دو پلوؤں کو ان کے دونوں شانوں پر لٹکایا اور ماتھے کو چوم کر کہا۔ "اللہ تعالیٰ تمہاری کوششوں کو کامیاب کرے، خدا حافظ"۔

جناب قاسمؑ کی عمر لڑکپن کی آخری حدود پر تھی۔ نکلتا ہوا قد، مضبوط بازو، چمکتا ہوا چہرہ۔ جب آپؑ گھوڑے پر سوار ہو کر شامیوں کے لشکر کے سامنے پہنچے تو کالے رنگ کی ڈھالوں کی کثرت سے یزیدی فوجیوں کے دستے کالے بادلوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس وقت ایک یزیدی فوجی نے جناب قاسمؑ کو دیکھ کر بے اختیار کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے جیسے کالے بادلوں سے چاند نمودار ہو گیا ہو۔" جناب قاسمؑ کے جسم پر نہ کوئی زرہ تھی نہ سر پر بھاری خود۔ آپ نے عام لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں تلوار تھی اور آپؑ تلوار کو ہوا میں لہرا لہرا کر کہہ رہے تھے۔

"میں حسنؑ ابن علیؑ کا فرزند ہوں، میں اولادِ پیغمبرؐ ہوں، تمہارے رسولؐ کی اولاد ہوں۔ تم نے رسولؐ کے نواسے حسینؑ کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ کیا غضب ہے کہ حسینؑ قیدیوں کی طرح محصور ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ بارانِ رحمت کبھی تمہیں سیراب نہ کرے۔"

اس رجز کو سنتے ہی یزیدی لشکر کے درندے بے قابو ہو کر ہر طرف سے جناب قاسمؑ پر حملہ آور ہو گئے۔ ایک درندہ خونخوار کتے کی طرح بھونکتا ہوا جناب قاسمؑ کی طرف لپکا۔

"اس لڑکے کو میں قتل کروں گا۔"

ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ قاسمؑ ابن حسنؑ بے خوفی کے ساتھ نعرے لگا رہے تھے اور دشمنوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ ایسے میں عمر بن سعد بن نفیل آگے بڑھا اور ایک موقع دیکھ کر اس نے جناب قاسمؑ کے سر پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ یہ وار اتنی طاقت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ جناب قاسمؑ خون میں نہاتے ہوئے زمین پر گر گئے۔

زمین پر گرتے گرتے انہوں نے بے اختیار اپنے چچا کو پکارا۔ "عمو جان! مدد کو آیئے۔"

امام عالی مقامؑ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بھتیجے کی آواز سن کر آپ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور غضب ناک شیر کی طرح دشمنوں کو روندتے ہوئے قاسمؑ کے قریب پہنچے۔ عمر ابن سعد بن نفیل ابھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے امام پر حملہ کرنا چاہا لیکن امام حسینؑ کی تلوار نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ کاٹ دیا۔ بازو کٹتے ہی وہ زمین پر گر گیا اور ساتھیوں کو مدد کے لیے پکارنے لگا۔

یزیدی فوجی اسے بچانے کے لیے ہر طرف سے حملہ آور ہو گئے۔ امام حسینؑ کی تلوار کوندنے لگی تھی۔ اس وقت کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حسینؑ کی تلوار کا سامنا کرتا۔ گھڑسوار آتے اور پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ اس بھگدڑ میں عمر ابن سعد بن نفیل گھوڑوں کے سموں سے کچل کر مارا گیا۔

فوجیں بھاگیں اور میدان خالی ہوا تو حسین علیہ السلام گھوڑے سے اتر کر اپنے بھتیجے کے قریب پہنچے۔ حسنؑ کا چراغ بجھ چکا تھا۔ قاسمؑ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ آپ کی لاش گھوڑوں کے دوڑنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔

امام حسینؑ نے قاسمؑ کے سرہانے بیٹھ کر کہا۔ "قاسم! تمہارے چچا کے لیے یہ بات کس قدر اذیت ناک ہے کہ تم چچا کو مدد کے لیے پکارو اور چچا بروقت تمہاری مدد کو نہ آ سکے۔"

یہ کہہ کر روتے روتے امام مظلومؑ نے قاسمؑ کی لاش کو کسی نہ کسی طرح سمیٹا اور اسے سینے سے لگا کر اپنے خیمے کی طرف بڑھنے لگے۔ جناب قاسمؑ کے پاؤں زمین کربلا پر رگڑتے جا رہے تھے اور آپ کے جسم سے بہنے والا خون امام عالی مقامؑ کے لباس کو رنگین کر رہا تھا۔

بے تیغ سپاہی

ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن ان کے آنسو کسی چوپائے کی آنکھوں سے بہنے والے پانی سے بھی زیادہ حقیر تھے کیونکہ وہ رو تو رہے تھے مگر آگے بڑھ کر امامؑ وقت کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھے۔

—*****—

سورج نکلتے ہی سارا میدان تنور کی طرح تپنے لگا تھا۔ زمین سے گرمی کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ اس بہت بڑے میدان میں دنیا کی انوکھی جنگ لڑی جارہی تھی۔ دریا کے کنارے کا سارا علاقہ گھوڑوں، خچروں، اونٹوں، خیموں اور انسانی شکل وصورت والے خونخوار درندوں سے پٹا پڑا تھا۔

کئی دن پہلے تیس ہزار حیوانوں نے وہاں موجود تھوڑے سے انسانوں کو دریا کے قریب سے ہٹا کر میدان کے بے آب و گیاہ حصے کی طرف خیمے لگانے پر مجبور کردیا تھا۔ انسانوں نے اس وقت ان درندوں سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس وقت وہ ان درندوں سے الجھ گئے تو ان حیوانوں کو حملہ کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ سو ڈیڑھ سو آدمی تیس ہزار درندوں سے کب تک لڑسکیں گے۔ اگر دریا سے ہٹانے پر جنگ ہوئی تو سارے انسان مارے جائیں گے اور بعد میں انسانی شکلوں والے یہ درندے دنیا بھر میں یہ مشہور کردیں گے کہ یہ جنگ پانی پر قبضہ کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ انسان ہم پر پانی بند

کر کے ہمیں پیاسا مار دینا چاہتے تھے اس لئے اپنی زندگی بچانے کے لئے ہم نے انسانوں پر حملہ کر کے نہر پر قبضہ کر لیا۔ پانی پر قبضہ کرنے والے اس جنگ میں مارے گئے۔

دنیا کی اس انوکھی جنگ کے دوران ایسے بہت سے موقع آئے لیکن انسانوں کے سردار نے صبر، برداشت اور اپنی دور اندیشی کے ذریعے ان درندوں کو ایسا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کی جانے والی عظیم قربانی کو غلط رنگ دے سکیں۔

انسانی شکل والے یہ درندے بلا کے چالاک تھے۔ ان کی شخصیت کئی کئی نقابوں میں چھپی ہوئی تھی۔ ان کے کردار پیاز کے چھلکوں کے طرح تہہ در تہہ واقع ہوئے تھے۔

تیس ہزار کا یہ لشکر ایسے ہی چالاک درندوں نے تیار کیا تھا اور انسانوں کا سردار ان انسان نما حیوانوں کی مکروہ شخصیت کے گرد لپٹے ایک ایک پردے، ایک ایک چھلکے کو اتار دینا چاہتا تھا تا کہ دنیا جان لے کہ دین اسلام کی خدمت کے بڑے بڑے دعوے کرنے والے ان انسان نما حیوانوں کی شخصیت اندر سے اللہ کی کس قدر دشمن، کس قدر گھناؤنی، سفاک اور بے رحم واقع ہوئی ہے۔

☆☆☆

سورج کافی اوپر اٹھ آیا تھا۔ دھوپ کی شدت میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ اب ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں، گھوڑوں کے دوڑنے سے فضا میں خاک اڑ رہی تھی۔ وحشی درندے خوشی سے ناچ رہے تھے۔ اپنی تلواریں، نیزے اور کمانیں ہوا میں اچھال اچھال کر فتح کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ نہر سے دور چلچلاتی دھوپ میں لگے ہوئے خیموں سے عورتوں کے بین اور بچوں کے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان خیموں کے باہر ان چند انسانوں کے خون میں نہائے ہوئے جسم بے حس و حرکت پڑے تھے جو اس صحرا میں انسانی شکل والے درندوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے تھے۔

انسانوں کا سردار اس وقت اکیلا تھا۔ دور دور تک نہ کوئی ساتھی نہ ہمدرد۔ نہ کوئی بات سننے والا، نہ کوئی دلاسہ دینے والا۔ اس کے سارے دوست مارے جا چکے تھے، سارے عزیز

دشمنوں سے لڑتے ہوئے ختم ہو گئے تھے۔

اس کے یہ سارے عزیز اور دوست بلا کے بہادر اور وفادار تھے۔ انہوں نے اپنے سردار سے جو وعدہ کیا تھا مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔

انسان اپنی جان تو دے سکتا ہے لیکن اپنے بعد اپنے بیوی بچوں کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتا ہے مگر ان وفادار، جانثار بہادروں کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کل کو ان کے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔ انہوں نے سوچا کہ اللہ کے دین کو بچانے کے لئے اگر ہم موت سے ڈریں گے تو موت کا خطرہ تو اپنی جگہ ہمیشہ رہے گا۔ آج ہم نے اپنی جانیں بچالیں تو کیا معلوم موت چند روز بعد ہی آجائے۔ موت کا کیا بھروسا! آج ہمیں بہترین موت مل رہی ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے مرنے سے بڑھ کر موت کا حسین ترین طریقہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔

اسی لئے یہ سب بہادر اپنے خون کا آخری قطرہ تک اللہ کی راہ میں بہا کر اب ہمیشہ کی زندگی حاصل کر چکے تھے اور اس وقت ان کے خون میں نہائے ہوئے جسم دریا سے دور چلچلاتی دھوپ میں بے حرکت پڑے تھے۔

ان کا سردار کبھی ان لاشوں کو دیکھتا، کبھی ان کے روشن چہروں کو دیکھتا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا کہ مالک ایسے باوفا ساتھی تو نہ میرے نانا کو ملے، نہ میرے بابا کو ملے۔ ایسے ساتھی آج تک کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئے جیسے دوست اور ساتھی تو نے مجھے عطا کیے!

جنگ بہ ظاہر ختم ہو چکی تھی۔ انسانی شکلوں والے درندوں کے مقابلے میں بس اب ایک انسان بچا تھا۔ ان درندوں کو اب جلدی ہو رہی تھی کہ اس آخری انسان کو بھی قتل کر کے فتح کا جشن منائیں، اپنے مالکوں سے انعام حاصل کریں اور انعام واکرام میں ملنے والی دولت، عہدوں، زمینوں، جائیدادوں کے ذریعے اپنی باقی زندگی آرام سے گزاریں۔

لیکن ان درندوں کو معلوم نہیں تھا کہ انسانوں کے سردار کے پاس ابھی ایک سپاہی باقی تھا۔ ایسا سپاہی جو کسی تلوار، تیر یا نیزے کے ذریعے جنگ کرنا نہیں جانتا۔ اس سپاہی کا

انداز جنگ ہی نرالا ہوگا۔ یہ سپاہی نہ تلوار چلائے گا نہ تیر لیکن یہ دشمنوں پر ایسا حملہ کرے گا کہ انسان نما حیوانوں کے دلوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس کا حملہ اس کے قاتل کو آنسو بہانے پر مجبور کر دے گا۔ اس کا یہ بے مثال حملہ تاریخ میں محفوظ ہو جائے گا اور اللہ کے دشمن قیامت تک اس کے وار سے گھائل ہوتے رہیں گے۔

☆☆☆

یہ سپاہی سن ساٹھ ہجری، رجب کے مہینے میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوا تھا اور جب یہ میدان جنگ میں آیا تو اس کی عمر صرف چھ ماہ تھی۔ اس کی ماں بھی بڑی بہادر خاتون تھیں۔ انہوں نے خود اسے اپنے شریک حیات، اپنے آقا و مولا حضرت امام حسینؑ کی گود میں دیا تھا۔

واقعہ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے دو بیٹے شہید ہوئے۔ بڑے بیٹے علی اکبرؑ کی ماں ام لیلیٰؑ تھیں اور چھوٹے بیٹے علی اصغرؑ کی والدہ کا نام ام ربابؑ تھا۔ جناب سکینہؑ بنت الحسینؑ جن کی عمر واقعہ کربلا کے وقت چار سال تھی سن چھپن ہجری میں مدینے میں ہی پیدا ہوئیں تھیں۔ ان کی والدہ بھی جناب ام ربابؑ تھیں۔ حضرت علیؑ ابن الحسینؑ جنہیں امام زین العابدینؑ یا امام سید سجادؑ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کی والدہ کا نام شہر بانوؑ تھا۔ جناب شہر بانوؑ ایران کے شہنشاہ کی بیٹی تھیں اور آپ کا انتقال امام علی ابن الحسینؑ کی ولادت کے چند ہفتے بعد ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ایک طرف ہزاروں درندوں کا لشکر تھا دوسری طرف امام وقت نواسہ رسولؐ تنہا کھڑے تھے۔ سورج آسمان کے عین درمیان میں چمک رہا تھا۔ لو کے تھپیڑوں میں آگ کی سی تپش تھی۔ تین دن کی بھوک پیاس، رشتے داروں کی موت کا غم، آپؑ کا سارا لباس اپنے اور اپنے دوستوں، رشتے داروں کے مقدس لہو سے رنگین ہو رہا تھا۔ اب نواسہ رسولؐ آخری صدائے استغاثہ بلند کر رہے تھے۔ کربلا میں موجود انسانوں کو آخری مرتبہ یہ موقع فراہم کر رہے تھے کہ وہ امام وقت کی مدد کر کے خود کو اللہ کے عذاب سے بچا سکیں۔

"ہے کوئی مظلوم کی مدد کرنے والا!"

امام حسین علیہ السلام کی صدا بلند ہوئی تو کربلا کے ریگزار میں شہید ہونے والوں کی لاشیں تڑپنے لگیں اس آواز کو سن کر انسان نما حیوانوں کے لشکر میں خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ تلواریں سنسنانے لگیں، نیزے ہوا میں اچھلنے لگے! وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ ابھی ایک بے تیغ سپاہی حسینؑ کی مدد کرنے کے لئے میدان میں پہنچنے والا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی صدائے استغاثہ چلچلاتی دھوپ میں لگے ہوئے خیموں میں پہنچی تو وہاں عجیب واقعہ ہوا۔ ایک ننھا سا بچہ جو بھوک پیاس کی شدت سے غشی کی سی حالت میں اپنے جھولے میں مدہوش پڑا تھا، امام وقتؑ کی آواز سن کر چونک پڑا اور جھولے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس بچے کی والدہ بی بی ام ربابؓ اسے سنبھالنے کے لئے دوڑیں لیکن بچہ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی خود کو جھولے سے نیچے گرا چکا تھا۔

ننھے سے علی اصغرؑ جب اپنے والد اور امام وقتؑ کی صدائے استغاثہ سن کر چونکے اور اپنی زبان میں امامؑ کی صدائے استغاثہ کا جواب دینے لگے تو خیمے میں موجود اس کی بہن، پھوپھیاں اور ان کی والدہ یہ سمجھیں کہ علی اصغرؑ بھوک پیاس سے بے تاب ہو کر رو رہے ہیں۔ سب لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔

بی بی فضہؓ اس گھر کی کنیز تھیں۔ ان سے برداشت نہ ہوا، وہ خیمے کے دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئیں اور امام حسین علیہ السلام کو پکارنے لگیں۔

امام علیہ السلام نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور میدان جنگ سے خیمے کی طرف آ گئے۔ ننھے سے علی اصغرؑ بس روئے جا رہے تھے۔ انہیں نہ ماں کی گود میں قرار آتا تھا نہ پھوپھیوں کے سنبھالنے سے سنبھلتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام خیمے میں تشریف لائے تو بی بی ام ربابؓ نے اپنے ننھے سے بچے کو اٹھا کر امام علیہ السلام کی گود میں دے دیا۔ حضرت علی اصغرؑ باپ کی گود میں آئے تو رونا دھونا بھول کر خوشی سے ہمکنے لگے۔ امام علیہ السلام

نے ان کی سوکھی زبان دیکھی اور ان کا ہمکنا دیکھا تو آپؑ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آپؑ انہیں لے کر خیمے سے باہر نکل آئے۔

باہر تیز دھوپ تھی۔ امامؑ نے انہیں اپنی عبا کے دامن کے سائے میں کرلیا اور میدان جنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے خون کے پیاسے درندوں کے غول پھیلے ہوئے تھے۔ انسانی شکلوں والے ان خونخوار درندوں نے امام حسینؑ کو اپنی عبا کے دامن میں کچھ لاتے ہوئے دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ حسین علیہ السلام قرآن اٹھا کر لا رہے ہیں تا کہ قرآن کا واسطہ دے کر اپنی جان کی امان طلب کریں۔

دراصل یہ سارے وہ نام نہاد مسلمان تھے جن کے نزدیک قرآن کا بس یہی مقصد تھا۔ یہ قرآن کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے جھوٹی قسمیں کھانے، دوسروں کو دھوکا دینے اور اپنی جان بچانے ہی کے لئے استعمال کرتے تھے۔

دشمنوں کے سامنے پہنچ کر امام حسین علیہ السلام نے اپنی لہو سے تر عبا کے دامن کو ہٹایا تو دیکھنے والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ امام حسین علیہ السلام کے ہاتھوں پر ایک بچہ تھا۔ اس کی زبان اینٹھی ہوئی تھی اور کمزوری کی وجہ سے ان کے ہونٹ گلاب کی سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح عنابی ہو رہے تھے۔

دیکھنے والوں میں بہت سے انسان نما حیوان ایسے بھی تھے جن کے اندر انسانیت کی تھوڑی سی رمق باقی تھی۔ انہوں نے ایک پھول جیسے بچے کو بھوک پیاس سے مرتے دیکھا تو لرز کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن ان کے آنسو کسی چوپائے کی آنکھوں سے بہنے والے پانی سے بھی زیادہ حقیر تھے کیونکہ وہ رو تو رہے تھے مگر آگے بڑھ کر امامِ وقت کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھے۔

امام حسین علیہ السلام کہہ رہے تھے: ''تمہارے خیال میں اگر میں قصوروار ہوں تو یہ بچہ تو قصوروار نہیں۔ اسے تین دن سے نہ دودھ ملا ہے نہ پانی کا ایک قطرہ اس کے منہ میں گیا ہے۔ تم اسے ذرا سا پانی پلا کر معصوم کی جان بچا سکتے ہو۔'' یہ کہتے کہتے امام علیہ السلام

نے یزیدی فوجیوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی کہ شاید کسی کو غیرت آ جائے، شاید کسی کا ضمیر جاگ اٹھے۔

کئی قسم کے حیوانوں سے تو وفاداری، شکر گزاری کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن امام حسین علیہ السلام کے سامنے تو حیوانوں سے بدتر مخلوق کھڑی تھی۔ امامؑ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو وہ اپنے منہ دوسری طرف کر کے رونے لگے۔

یزیدی لشکر کے سردار عمر ابن سعد نے اپنے فوجیوں کو اس طرح آنسو بہاتے دیکھا تو وہ ڈر گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو ساری فوج میرے مخالف ہو جائے۔ اس بچے کے معصوم چہرے نے سفاک درندوں کو لرزا دیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ فوج میں بغاوت ہو جائے۔ سپاہی ایک دوسرے کے خلاف تلواریں کھینچ لیں۔ یہ سوچ کر عمر ابن سعد گھبرا گیا۔ اس نے اپنے ایک ماہر تیر انداز کو اشارہ کیا۔ اس تیر انداز کا نام حرملہ تھا۔ عمر ابن سعد نے حرملہ سے کہا:

''جلدی کر..... حسینؑ کی گفتگو کو اپنے تیر سے کاٹ دے۔''

حرملہ نے اپنا تیز دھار کا تین شاخوں والا تیر کمان میں جوڑا اور کمان کو اس کی آخری حد تک کھینچ کر چھوڑ دیا۔ تیر ہوا میں سنسناتا ہوا اپنے نشانے تک پہنچا اور نواسہ رسولؐ کے بازو کو چھیلتا ہوا ان کے معصوم بچے کی گردن میں اتر گیا۔

تیر کا لگنا تھا کہ حضرت علی اصغرؑ کے ہونٹوں کے کنارے سے خون ابلنے لگا۔ اس وقت ایک لمحے کو ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اگلے ہی لمحے وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح تڑپنے لگے۔

ان کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ یزیدیت کے چہرے پر ایک ایسا وار تھی جس نے میدان کربلا میں موجود کسی یزیدی کو زخمی کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ تیر مار کر خود حرملہ کے ہاتھوں پر لرزہ طاری ہو گیا اور فتح کی خوشی میں نعرے لگانے والے آنسو بہانے پر مجبور ہو گئے۔

قبروں کی جگہ

اب کربلامیں آنے والی یزیدی فوج کی حیثیت ایک جارح اور حملہ آور فوج کی تھی جو حسینؑ ابن علی کی ذاتی جاگیر میں گھس کر سرکاری دہشت گردی کی مرتکب ہونیوالی تھی۔

*****

قافلہ حسینی جو آٹھ ذی الحجہ کو مکے سے نکلا تھا، حجاز و عراق کی آبادیوں، ریگستانوں، پہاڑوں اور ویرانوں میں سخت گرمی، گرد وغبار اور دشوار گزار راستوں سے گزرتا ابطح، تنعیم، صفاح، وادی عتیق، وادی صفاء، ذاتِ عرق، بطنِ رمہ، فید، اجفر، خزیمیہ، شقوق، زرود، ثعلبیہ، زبالہ، القاع، عقبتہ البطن، شراف، ذوحسم، بیضہ، رہیمہ، غدیب الھجانات، قطقطانیہ اور قصر بنی مقاتل نامی مختلف منزلوں پر ٹھہرتا، ہر منزل پر خوف و دہشت سے بھرپور ایک نئی خبر کو سنتا، آہستہ آہستہ دشتِ نینواء کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس قافلے کو سفر کرتے ہوئے چوبیس دن گزر چکے تھے۔

کوفے کے یزیدی گورنر عبید اللہ ابن زیاد کا فوجی دستہ جو نواسۂ رسول کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا گیا تھا منزل ذوحسم پر قافلہ حسینی کے سامنے آیا لیکن اس طرح کہ اس فوجی دستے کے مسلح فوجی اور سواری کے اونٹ اور گھوڑے پیاس کی شدت سے موت کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یزیدی لشکر کے یہ رینجرز جن کی کمانڈ حُر ابن یزید ریاحی کے پاس تھی، کوفے کے صحرائی علاقے میں راستہ بھٹک گئے تھے۔ ان کا پانی ختم ہوگیا تھا اور وہ صحرائی ٹیلوں

کے درمیان زندگی کا راستہ تلاش کرتے کرتے موت کے قریب پہنچ رہے تھے کہ مُردوں کو زندہ کرنے والے امامِ وقت، سید الشہدؑاء حضرت امام حسینؑ کا قافلہ انہیں نظر آ گیا۔

امام حسینؑ نے ان فوجیوں اور چوپایوں کی پیاس دیکھی تو آپ بے قرار ہو گئے۔ آپؑ نے اپنے اصحاب سے کہا۔ ''انہیں اور ان کی سواریوں کو پانی پلاؤ۔''

ہزار فوجیوں کی اس پلاٹون میں زندگی آئی تو انہیں اپنا فرض یاد آیا اور انہوں نے قافلہ حسینی کو گھیرنا شروع کر دیا اور اس طرح ایک دفعہ پھر وہ اپنی موت کی طرف بڑھنے لگے۔ اس موقع پر صرف ایک آدمی کے دل میں زندگی کی شمع روشن ہوئی۔ یہ رینجرز کی اس پلاٹون کا کمانڈر تھا اور اس کا نام تھا۔ حُر ابن یزید ریاحی۔

☆☆☆

قافلہ حسینی نے اپنا سفر جاری رکھا اور حر ابن یزید ریاحی کا فوجی دستہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مکے سے سفر کا آغاز کیے ۵۳ دن گزرے تھے کہ امام حسینؑ کا گھوڑا چلتے چلتے ایک جگہ زمین میں قدم گاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس زمین کی مٹی میں شہیدوں کے لہو کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور محرم الحرام سن ساٹھ ہجری کی دوسری تاریخ۔

قافلہ حسینی کربلا کی بے آب و گیاہ زمین پر کھڑا تھا۔ ارد گرد بہت بڑا صحرائی علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ کہیں ریگستان، کہیں ہریالی، کھیت، آبادیاں، گاؤں، دیہات، کچے پکے مکانات، بدوؤں کے خیمے، مٹی کے ٹیلے اور ریت کی ادھر سے ادھر منتقل ہونے والی پہاڑیاں۔ ان دیہاتوں اور آبادیوں کے الگ الگ نام تھے۔ کربلا، نینوا، غاضریہ، ماریہ، شطِ فرات، عقر بابل۔

دریائے فرات سے نکلنے والی ایک چھوٹی سی ندی کربلا کے شمال مشرق کی جانب پھیلے ہوئے ریگستانوں، ٹیلوں اور نشیبوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی غاضریہ کے نخلستان تک آتی تھی اور اس علاقے کو سیراب کرتی ہوئی ذوالکفل نامی گاؤں کے قریب دوبارہ دریائے فرات سے جا کر مل جاتی تھی۔ اس چھوٹی سی ندی کا اصل نام نہر علقمہ تھا لیکن اسے فراتِ

صغیر بھی کہا جاتا تھا۔

نہر علقمہ اس وقت پانی سے لبریز تھی۔ اس کا پانی اس کے کناروں سے اوپر خود رو گھاس کے اندر سے سرسر کرکے بہہ رہا تھا۔ غاضریہ کے نخلستان میں کھجوروں کے لمبے لمبے درخت گرم ہوا کے تھپیڑوں میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔

آنے والے چند دنوں میں اس علاقے میں ایک عظیم سانحہ، ایک عظیم معجزہ رونما ہونا تھا۔ غاضریہ کے نخلستان میں گرم ہوا کے تھپیڑوں میں کھڑے ہوئے ان درختوں کے نیچے ایک باوفا غلام ایک جانثار بھائی، ایک محبت کرنے والے چچا اور ایک بے مثال بہادر، علم دار لشکر حسینی ابوالفضل العباسؑ کے بازو قلم ہونا تھے۔ سقائے سکینہؑ کے بازوؤں پر حملہ کرنے والے حکیم بن طفیل اور زید بن ورقاء نامی بزدلوں نے کھجور کے انہی درختوں کے پیچھے چھپ کر سقائے سکینہؑ پر حملہ کیا تھا۔ تلواروں کے ہجوم میں گھرتے ہوئے حضرت عباسؑ نے بے ساختہ کہا۔ ''موت کتنے ہی نعرے لگائے میں اس سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ میں مشک لے کر جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا۔ میرا نام عباس ہے۔''

حکیم بن طفیل اور زید بن ورقاء سامنے سے تو حملہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے اس لیے غاضریہ کے نخلستان میں کھڑے ہوئے کھجور کے درختوں کے پیچھے چھپ گئے اور جب عباس علمدارؑ جنگ کرتے کرتے ادھر سے گزرے تو حکیم بن طفیل نے آپؑ کے سیدھے بازو پر بھرپور طاقت سے تلوار ماری اور سقائے سکینہؑ کا دایاں بازو کٹ کر زمین پر جا گرا۔ عباسؑ وفادار نے علم کو بائیں شانے پر لیا اور گرج کر کہا۔ ''اگر تم نے میرا دایاں بازو الگ کر دیا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں دین اسلام کی حمایت کرنا چھوڑ دوں گا۔''

اس کے بعد دوسری طرف سے دوسرا درندہ کھجور کے درخت کے پیچھے سے نکلا اور اس کی تلوار آپؑ کے دوسرے بازو کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ عین اسی وقت کسی نے سر مبارک پر ایک گرز مارا اور ایک تیر کہیں سے سنسناتا ہوا آیا اور مشکِ سکینہؑ میں پیوست ہو گیا اور عباسؑ علمدار گھوڑے کی پشت پر پھسلتے ہوئے زمین پر گر گئے اور ایسے گرے کہ پھر غاضریہ

کی اس زمین سے اسی وقت اٹھیں گے جب میدانِ قیامت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے کہیں گے کہ بیٹی! امت کی شفاعت کے لیے تمہارے پاس کیا ذریعہ ہے؟

اس وقت جناب زہراؑ امام حسین علیہ السلام کا تیروں سے چھدا ہوا تار تار کرتا اور اپنے نورِ نظر عباسؑ ابن علیؑ کے کٹے ہوئے بازو دربارِ الٰہی میں لائیں گی اور فرمائیں گی کہ اُمت کی شفاعت کے لیے میرے بیٹے عباسؑ کے یہ کٹے ہوئے بازو ہی کافی ہیں۔

☆☆☆

سفری انتظامات کرنے والے غلام اونٹوں پر سے خیمے، قناتیں اور دوسرا سامان اتارنے میں مصروف ہوگئے لیکن ابھی خیمے نصب بھی نہیں ہوئے تھے کہ امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے ذریعے اردگرد پھیلے ہوئے گاؤں اور دیہات کے باشندوں کو بلوایا۔

یہ سب قبیلہ بن اسد کے افراد تھے اور اس وسیع و عریض صحرا کے مختلف حصوں میں آباد تھے۔ یہ سارا علاقہ اسی قبیلے کی ملکیت تھا۔ قافلے کو یہاں ٹھہرتے دیکھ کر عورتیں، مرد اور بچے بھی ادھر ادھر سے نکل کر اسی طرف بھاگے چلے آرہے تھے لیکن امام حسینؑ کو اس زمین کے اصل مالکوں سے بات کرنا تھی اسی لیے انہوں نے بنی اسد کے سرداروں کو اپنے پاس بلوایا تھا۔

ذرا ہی دیر میں قبیلہ بنی اسد کے کئی بزرگ وہاں آپہنچے۔ انہوں نے سلام دعا کے بعد سب سے پہلے امام حسینؑ سے کہا۔ ''آپ کا ارادہ اگر اس جگہ ٹھہرنے کا ہے تو خدا کے واسطے اس جگہ خیمے نہ لگائیں جتنی جلدی ہو یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔''

''کیوں؟'' قافلہ حسینی میں سے کسی شخص نے سوال کیا۔

''یہ جگہ بہت منحوس ہے۔ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ کوئی بھی نبی یا پیغمبر جو یہاں آیا وہ سخت مشکلات اور پریشانیوں میں گھر گیا۔'' ایک ضعیف العمر شخص نے جواب دیا۔

''آپ لوگ خود دیکھ رہے ہیں کہ جس جگہ آپ خیمے لگانا چاہتے ہیں یہ جگہ کس قدر ویران لگ رہی ہے۔ ہم تو یہیں رہتے آئے ہیں لیکن اس جگہ ہم بس مجبوراً ہی آتے ہیں۔ ہماری کھیتی باڑی، مال مویشی، گھر بار سب یہاں سے فاصلے پر ہیں۔'' ایک اور شخص نے بتایا۔

''اللہ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔'' امام حسینؑ نے بڑے اطمینان کے ساتھ انہیں مخاطب کیا۔ ''دیکھو! ہم تمہاری یہ ساری زمین خریدنا چاہتے ہیں۔''

''کون سی زمین؟'' بنی اسد کا ایک فرد بولا۔

''اس علاقے کی ساری زمین۔'' امام حسینؑ نے جواب دیا۔

''یہ تو ایک ویران جگہ ہے؟'' اس شخص نے حیرت کہا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اب اس زمین کی قسمت پلٹنے کے دن آ گئے ہیں۔ اس زمین کی نحوست اور بے برکتی ختم ہونے والی تھی۔

''ہم یہ ساری زمین خریدنا چاہتے ہیں لیکن اس طرح کہ اسے خرید کر اس کی منہ مانگی قیمت تمہارے حوالے کر کے اسے ہم دوبارہ تمہارے نام کر دیں گے۔'' امام حسینؑ نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''یعنی یہ زمین دوبارہ ہماری ملکیت بن جائے گی!'' بنی اسد کے ایک شخص نے خوش ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ زمین تمہارے ہی پاس رہے گی اور تم ہی اس سے فائدہ اٹھاؤ گے لیکن تین شرائط کے ساتھ....'' امام حسینؑ نے فرمایا۔ ''پہلی شرط یہ کہ اگر ہم سب لوگ یہاں قتل کر دیے جائیں تو دشمن کی فوج کے یہاں سے جانے کے بعد ہماری لاشوں کو دفن کر دینا۔ دوسری شرط یہ کہ جب ہمارے چاہنے والے ہماری قبروں کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئیں تو انہیں ہماری قبروں تک پہنچانا اور تیسری شرط یہ ہے کہ ہمارے جو زائرین یہاں آئیں تو انہیں تین دن تک اپنا مہمان بنا کر رکھنا۔''

''ٹھیک ہے، ہمیں ساری شرطیں منظور ہیں۔'' قبیلہ بنی اسد کے سرداروں نے جواب دیا۔

امام حسینؑ نے ان سے زمین کی قیمت معلوم کی تو انہوں نے ساٹھ ہزار درہم مانگے۔
امام حسینؑ نے ساٹھ ہزار درہم ان کے حوالے کر کے اس وسیع و عریض زمین کی ملکیت کی دستاویز حاصل کی اور پھر اس زمین کو دوبارہ قبیلہ بنی اسد کے نام ہبہ کر دیا۔ اب یہ سارا علاقہ نواسۂ رسولؐ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی ملکیت بن چکا تھا۔
زمین کی خریداری کر کے نواسۂ رسولؐ نے یزیدی بیوروکریسی، خفیہ ایجنسیوں اور یزید کے دستر خوان سے بچی ہوئی ہڈیاں چبانے والے اس دور اور آئندہ زمانوں کے تاریخ نویسوں، تجزیہ نگاروں اور خطیبوں کے منہ بند کر دیے تھے۔ اب کربلا میں آنے والی یزیدی فوج کی حیثیت ایک جارح اور حملہ آور فوج کی تھی جو حسینؑ ابن علیؑ کی ذاتی جاگیر میں گھس کر سرکاری دہشت گردی کی مرتکب ہونے والی تھی۔
یہ جگہ امام حسینؑ نے اپنے باوفا عزیزوں اور جانثار اصحابؓ کی قبروں کے لیے پسند فرمائی تھی۔ امامؑ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں کسی غیر کی زمین میں دفن کی جائیں۔ اب اس زمین کا مقدر بدلنے والا تھا۔
مکہ معظّمہ کا پہاڑی علاقہ بھی تو ایک بہت بڑے صحرا میں واقع تھا۔ گزرنے والے قافلے یہاں سے تیز تیز گزر جایا کرتے تھے کہ یہاں نہ پانی تھا، نہ سایہ، نہ انسانی آبادی لیکن جب حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ یہاں اپنے اس بیٹے کو لے کر آئے جسے اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا امتحان دینا تھا تو مکے کے اردگرد پھیلے صحرا کی قسمت بدل گئی۔ یہاں خانہ کعبہ ظاہر ہوا تو ساری دنیا سے لوگ کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آنے لگے۔
اب صدیوں بعد ابراہیمؑ خلیل اللہ کا وارث ایک بے آب و گیاہ صحرا میں اللہ کے وجود کی گواہی دینے والوں کے لیے ایک نیا کعبہ عقیدت تعمیر کر رہا تھا۔

☆☆☆

دو محرم سے دس محرم کے دوران یہاں ایک قیامت آ کر گزر گئی۔ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے نواسۂ رسولؐ کی اس جاگیر میں گھس کر وہ بدترین ظلم کیے کہ انسانیت شرما

گئی۔ یہ ریاستی دہشت گردی کی بدترین مثال تھی۔ اپنے زانی و شرابی حکمران یزید ابن معاویہ کی بیعت نہ کرنے پر انہی مسلمانوں نے خاندان رسالت کے ایک ایک فرد کو بھوکا پیاسا ذبح کرڈالا، اپنے نبیؐ کے گھر کو جلا کر خاک کردیا اور پیغمبرؐ کی نواسیوں کے سروں سے چادریں چھین کر انہیں رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کا یہ لشکر اللہ اکبر کے فاتحانہ نعرے لگاتا، خوشی کے ڈھول بجاتا کوفے کی طرف لوٹ گیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنے مُردوں کو دفن کیا اور خاندانِ رسالت کے شہیدوں کی لاشوں کو کھلے آسمان کے نیچے بے گور و کفن چھوڑ دیا۔ ان مقدس لاشوں کے سر کاٹ کر نیزوں پر بلند کر کے کوفے لے جائے گئے تاکہ وہاں موجود یزیدی گورنر عبید اللہ ابن زیاد سے انعام و اکرام وصول کیا جائے اور ابن زیاد اپنی اس درندگی کا انعام اپنے آقا یزید ابن معاویہ سے وصول کر سکے۔

تمام لشکریوں کے جانے کے بعد جب میدانِ کربلا میں سناٹا ہوا اور قبیلہ بنی اسد کے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ حکومت کی فوجیں واپس جاچکی ہیں تو وہ اپنے اپنے گھروں سے نکلے اور انہوں نے میدانِ کربلا، شطِ فرات، نہر علقمہ اور نینوا کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی بے گور و کفن لاشوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔

اسی دوران حضرت علیؑ ابن الحسینؑ امام سجاد اپنی خدائی طاقت کے ذریعے کربلا واپس آئے اور انہوں نے آ کر ان لاشوں کو شناخت کیا کہ کون سی لاش کس شہید کی ہے۔ خاندانِ رسالت کے ہر شہید کا سر کاٹ لیا گیا تھا۔ امام زین العابدینؑ ہی نے قبروں کی جگہ طے کی اور نماز جنازہ پڑھا کر تمام شہیدوں کو ریگزار کربلا میں سپرد خاک کردیا گیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ اسیرانِ کربلا کوفہ و شام میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے آخر کار ایک دن آزاد کردیے گئے۔ اسیروں کا قافلہ واپس مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ مدینے واپس پہنچ کر امام زین العابدینؑ نے اپنی زمینوں پر دن رات محنت کرنا شروع کردی۔ اپنی

زراعت کو ترقی دی۔ مدینے میں اس وقت آپؑ کے دادا امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے کھودے ہوئے دس کنویں موجود تھے۔ یزید کے باپ نے اپنے زمانے میں ان کنوؤں کی معاشی اہمیت کا اندازہ لگا کر انہیں حضرت امام حسینؑ سے خریدنا چاہا تھا لیکن امام حسینؑ نے انہیں فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امام زین العابدینؑ ساٹھ ہزار درہم کے اس قرض سے واقف تھے جو اُن کے بابا مدینے کے زمیں داروں سے لے کر گئے تھے۔ ان کے بابا نے اپنی آخری وصیت میں اس قرض کی ادائیگی کا بھی حکم دیا تھا اس لیے مدینے واپسی کے بعد امام زین العابدینؑ نے اپنی زراعت کو ترقی دے کر بہت سی دولت کمائی جو رقم کم پڑ رہی تھی اس کے لیے آپؑ نے اپنے خاندان کے دو کنوؤں کو اچھے داموں فروخت کیا اور اس ساری رقم سے سید الشہداؑ کے اس قرض کو ادا کیا جو آپؑ مدینے سے نکلتے وقت مدینے کے زمینداروں سے لے کر گئے تھے تاکہ ریگزارِ کربلا میں اپنی قبروں کی جگہ خریدی جاسکے اور اپنے چاہنے والوں کے لیے ایک شہر آباد کیا جائے۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ یزیدی ظلم وستم کی بدولت بنو امیہ کی حکومت کا چراغ گل ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباسؓ کی اولاد نے خونِ حسینؑ کے انتقام لینے کے نعرے پر حکومت حاصل کر لی لیکن خاندان اہل بیتؑ، ان کے فضائل اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی شخصیت بنو عباس کی آنکھوں میں بھی کھٹکنے لگی۔ اس کے بعد عباسی بادشاہوں نے خاندانِ رسالتؐ پر وہ ظلم وستم کیے جو بنو امیہ نے بھی نہیں کیے تھے۔ بنو عباس کے حکمرانوں کو بھی یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کسی نہ کسی طرح خاندانِ رسولؐ، ائمہ اہل بیتؑ اور ان کی نشانیوں کو دنیا سے مٹا دیا جائے۔

کربلا میں شہیدوں کی قبروں کی جگہ گزشتہ سو سوا سو سال کے اندر اہل بیتؑ کے چاہنے والوں کی عقیدت کا مرکز بن چکی تھی۔ لوگ ہزار طرح کی مصیبتیں برداشت کرنے

کے باوجود کسی نہ کسی طرح ان قبروں کی زیارت کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔ یہ قبریں ایک بہت بڑے صحرا کے درمیان تھیں اس لیے ان قبروں کو تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن اللہ نے اپنے پیاروں کی قبروں تک رہنمائی کا ایک راستہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ بیری کا وہ درخت تھا جو سید الشہداءؑ کی قبر مبارک کے سرہانے کی طرف سے نکلا تھا اور ان گزرتے وقتوں میں ایک بہت بڑے تناور پیڑ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب شہیدوں کی قبروں کی تلاش مشکل نہیں رہی تھی۔ دشتِ نینواء میں داخل ہونے والے زائرین کو یہ سرسبز پیڑ دور ہی سے نظر آنے لگتا تھا اور وہ شمع کے پروانوں کی مانند اس کی طرف دوڑنے لگتے۔

بیری کا یہ پیڑ اب شہیدان کربلا کی قبروں کا نشان بن گیا تھا۔ اسی لیے بیری کا یہ پیڑ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ یزیدی حکومت کی بھی یہی کوشش تھی کہ واقعہ کربلا کو صحرائے کربلا میں دفن کر دیا جائے، ظلم وستم کے یہ واقعات صحرا ہی میں گم ہو جائیں لیکن یزیدی خاندان کی پوری حکومت یہ خواب دیکھتے دیکھتے زمین میں دفن ہو گئی اور شہیدوں کی قربانیاں سارے عالم میں پھیلتی رہیں۔

اب بنو عباس کا دور حکومت تھا۔ اس دور میں کربلا میں قبروں کی اس جگہ نے ہارون رشید عباسی کی نیندیں اڑا دیں۔ اسے حکومت کی خفیہ ایجنسیوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ عوام کربلا کے شہیدوں کی قبروں تک نہ پہنچ پائیں تو آپ بیری کے اس درخت کو کٹوا دیں جو صحرا میں زائرین کے لیے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

ہارون رشید کو یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے بیری کے اس درخت کو جڑ کے قریب سے کٹوا دیا۔ حالانکہ وہ بہت پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث سن چکا تھا کہ جو شخص بیری کے (اس) درخت کو کاٹے گا وہ آخرت میں جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ یہ واقعہ ہارون رشید عباسی کے دور حکومت میں پیش آیا۔

☆☆☆

دوسری صدی ہجری میں متوکل عباسی اسلامی مملکت کا بادشاہ بن گیا۔ یہ سخت دشمن اہل

بیٹا اور بدکردار انسان تھا۔ اِس عرصے میں کربلا میں کچی قبروں کے اوپر مزارات بن چکے تھے اور ساری دنیا کے حریت پسند، حق کو چاہنے والے، مظلومیت امام حسینؑ پر ماتم کرنے والے شب و روز قبروں کی اس جگہ زیارت کرنے آتے رہتے تھے۔ عباسی حکمران ابو الفضل جعفر جس کا لقب متوکل تھا، وہ حق کی ان نشانیوں، جرات و بہادری کی ان مشعلوں کو بھلا کس طرح برداشت کرسکتا تھا۔

اس نے پہلے تو کربلا جانے والوں پر پابندی عائد کی لیکن جب سخت سزاؤں کو برداشت کرنے کے باوجود حق پرستوں کے قافلے کربلا جانے سے نہ رُکے تو اُس نے حکم دیا کہ ان تمام روضوں کو مسمار کردیا جائے اور قبروں کے اوپر ہل چلا کر زمین کو زراعت کے لیے استعمال کیا جائے۔

سرکاری اہلکاروں نے یہاں آ کر قبروں کی جگہ پر ہل چلانا چاہے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کوئی بیل قبروں کی جگہ پر جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ آخر کار علقمہ سے نالی کھود کر یہاں تک لائی گئی تاکہ قبر سید الشہدا کو پانی کے ذریعے مٹا دیا جائے لیکن اس وقت انہوں نے اللہ کا ایک اور معجزہ دیکھا۔ نہر علقمہ سے آنے والا پانی کا ریلہ قبر مبارک کے چاروں طرف گھومنے لگا اور پھر دوسری طرف نکل گیا۔ پانی کو سید الشہدا کا اس طرح طواف کرکے جاتے ہوئے دیکھا تو دیکھنے والوں نے اس جگہ کو ''حائر'' کا نام دے دیا۔ حائر اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں پانی آ کر گزر جائے۔

☆☆☆

پھر ایک دن متوکل بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بنو امیہ کی طرح بنو عباس کے محلات بھی کھنڈرات میں بدل کر قبرستانوں کا منظر پیش کرنے لگے اور کربلا کے ریگ زار میں قبروں کی جگہ کے اردگرد زندگی سے بھرپور ایک شہر ابھر آیا جہاں دنیا کے بادشاہ، نواب، راجا مہاراجا آتے اور اپنے سر کے تاج ان قبروں میں سونے والوں کے قدموں میں رکھ کر دست بستہ کھڑے ہوجاتے اور شہیدوں کے صدقے میں اللہ سے اپنی حاجتیں طلب کرتے۔

یہ جاگیر حسینؑ ابن علیؑ آج بھی حسین علیہ السلام کی ملکیت ہے جسے آپؑ نے بنی اسد کے لوگوں سے ساٹھ ہزار درہم میں خریدا تھا۔ اس لیے کہ نہ آپؑ کسی کی زمین پر رہنا چاہتے تھے، نہ کسی غیر کی زمین پر دفن ہونا آپؑ کے شایانِ شان تھا اور نہ آپ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ جب آپؑ کے زائر، آپؑ سے محبت کرنے والے، آپؑ کے خاندان اور آل و اولاد کے لوگ اپنے بہادر اور غیور آقا و مولاؑ کی زیارت کے لیے یہاں آئیں تو خود کو کسی غیر کے احسان تلے محسوس کریں!

☆☆☆☆☆

رے کی حکومت

ابنِ زیاد مسلمانوں کی شخصیت پرستی سے بھی واقف تھا اور ظالم اور جابر حکومت کی ضرورت سے بھی جسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور دین اسلام کو مسخ کرنے کے لیے اس جیسے نام نہاد علماء کی تلاش رہتی تھی۔

—*****—

رات کی سیاہی گہری ہوگئی تھی۔ ستاروں کی روشنی کے مدہم اُجالے نے سارے میدان کو گھیر رکھا تھا۔ قریب دیکھنے سے اس روشنی کا احساس ہوتا تھا لیکن دور کے صحرائی ٹیلے تاریکی میں ڈوبے نظر آتے تھے۔ دریائے فرات کے کنارے کنارے دور تک یزیدی فوج کے خیمے نصب تھے۔ دریا سے کافی فاصلے پر نواسۂ رسولؐ امام عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے اعزہ و احباب کے خیمے باہر سے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن ان کے اندر ایمان وعمل کی روشنی جگمگا رہی تھی۔

نواسۂ رسولؐ رات کے آخری پہر ایمان کی روشنی سے جگ مگ کرتے ان خیموں سے باہر تشریف لائے۔ آپؑ کے ساتھ حضرت علی اکبرؑ اور حضرت عباسؑ کے علاوہ اٹھارہ دوسرے جری، بہادر اور نڈر ساتھی بھی تھے۔ امام حسین علیہ السلام ان بہادروں کے درمیان بڑے پُر وقار انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے یزیدی فوج کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اسی وقت لشکر یزید کا سپہ سالار عمر ابن سعد اپنے بیٹے، غلام اور مزید اٹھارہ سپاہیوں

کے ہمراہ اپنے خیمے سے نکلا۔ اس کا رخ خیمہ حسینی کی جانب تھا۔ وہ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السلام سے جنگ کرنے کے عظیم گناہ سے بچنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے اپنے دو مختلف نمائندوں کے ذریعے نواسۂ رسولؐ سے بات چیت کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔ حضرت امام حسینؑ صلح کی ہر اس تجویز پر غور کرنے کے لیے تیار تھے جس کے ذریعے مسلمانوں کا خون بھی نہ بہے اور انہیں اپنے مقاصد بھی حاصل ہو جائیں۔ اسی لیے شام کے وقت یہ طے پایا تھا کہ اس طرح کی میٹنگ رات کے وقت میدان کے اس حصے میں کی جائے جو قافلہ حسینی اور لشکر یزیدی کے درمیان میں واقع ہے۔

ستاروں کی مدہم روشنی کے نیچے دونوں وفود ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ ''فرزند رسولؐ! بہتر ہوگا کہ ہم حفاظت کرنے والے سپاہیوں کو ذرا فاصلے پر رکھیں۔ گفتگو میں صرف آپ، آپ کے دو ساتھی اور میں اور میرے دو ساتھی شریک ہوں۔'' عمر ابنِ سعد نے قریب آ کر کہا۔

''کوئی حرج نہیں''۔ امام عالی مقام نے فرمایا۔ یہ سن کر لشکر یزیدی کے سالار نے اپنے حفاظتی دستے کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اب اس کے ساتھ صرف اس کا ایک بیٹا اور غلام رہ گیا۔ ادھر جانثاران امام حسینؑ بھی ایک جگہ ٹھہر گئے اور امام عالی مقامؑ اپنے بیٹے شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ اور اپنے قوتِ بازو حضرت ابوالفضل عباسؑ کو ساتھ لے کر آگے بڑھے۔ یہ دونوں وفود ریت کے ایک ٹیلے کے قریب ایک دوسرے کے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

عمر ابن سعد صحابی رسولؐ جناب سعد بن وقاصؓ کا بیٹا تھا۔ یہ بڑا عالم آدمی تھا۔ اس کے علم کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اسے رسول اللہؐ کی چھ ہزار احادیث زبانی یاد تھیں۔ وہ نماز بھی پڑھتا تھا، روزے بھی رکھتا تھا، قرآن مجید بھی یقیناً اس نے حفظ کر رکھا ہوگا۔ اس کی شہرت اس کی علمیت اور قابلیت کی وجہ سے تھی۔ یزیدی گورنر عبید اللہ ابن زیاد

نے اسی سبب سے نواسۂ رسولؐ سے جنگ کے لیے اسے سپہ سالار بنایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب عمر ابن سعد جیسا عالم شخص اس جنگی مہم کی کمان سنبھالے گا تو عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں آسانی رہے گی۔

ظالم و جابر حکومتیں مذہبی رہنماؤں کو اسی طرح استعمال کرتی ہیں۔ عوام ان علماء پر اعتماد کرتے ہیں، ان کے ہر عمل کو ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں جب کہ ایسے ''علما'' بکنے والی چیز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بس ان کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور یہ اسلام کی عبا اوڑھ کر، قرآن و حدیث کا رعب جما کر اپنی پوری قوم کو دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں اور قوم کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ بہت سستے داموں کسی اور کے ہاتھوں فروخت ہو چکی ہے۔

عمر ابن سعد کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ اس کے والد صحابیٔ رسولؐ تھے۔ وہ مسلمانوں کی شخصیت پرستی سے بھی واقف تھا اور ظالم اور جابر حکومت کی ضرورت سے بھی جسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور دین اسلام کو مسخ کرنے کے لیے اس جیسے نام نہاد علماء کی تلاش رہتی تھی۔ اسی لیے عمر ابن سعد نے حاکم شام معاویہ ابن ابوسفیان کے دور حکومت میں اپنی خدمات بنی امیہ کی حکومت کے ہاتھوں فروخت کرنے کے لیے ایک درخواست دے رکھی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ معاویہ ابن ابوسفیان کی حکومت اس کی ''خدمات'' سے فائدہ اٹھائے اور اس کے بدلے میں اسے رَے (یعنی موجودہ تہران کے مضافاتی علاقے) کے صوبے کی گورنری عطا کر دی جائے۔

اس کی یہ درخواست بنی امیہ کی خفیہ ایجنسیوں کے ریکارڈ میں موجود تھی اور حکومتی اہل کار اس بات کا جائزہ لے رہے تھے کہ اس عالم دین کی شخصیت سے کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی عرصے میں امیر شام دنیا سے اس مقام کی طرف چلے گئے جہاں انہیں اپنے اعمال کی بنیاد پر جانا تھا۔ یزید ابن معاویہ نے مسلمانوں کے بادشاہ کے طور پر مسند حکومت سنبھالی اور جو کام معاویہ ابن ابوسفیان آہستگی سے کرنا چاہ رہے

تھے، یزید نے اس کام کی رفتار کو تیز رفتاری سے آگے بڑھانے کا فیصلہ کرلیا۔

سن ساٹھ ہجری میں امیر شام کے دنیا سے چلے جانے کے بعد کوفے کے مسلمانوں نے حکومت کی تبدیلی کے خواب دیکھنا شروع کردیے۔ ان میں دو طرح کے لوگ شامل تھے۔ ایک تو کوفے کے عام مسلمان تھے جنھیں امیر شام کے زمانے کے گورنروں مغیرہ بن شعبہ اور زیاد ابن ابیہ نے ظلم وستم کی چکی میں اچھی طرح پیسا تھا۔ یہ وہ سزا تھی جو کوفے کے باشندوں کو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے دھوکے بازیاں، بے وفائیاں اور غداریاں کرنے کے جرم میں قدرت کے ہاتھوں انھیں ظالم حکمرانوں کی شکل میں ملی تھی۔

مسلمانوں کا یہ گروہ دراصل بنو امیہ کے سابقہ گورنروں اور حکومت کی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لیے بغاوت کی تیاری کررہا تھا۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ علی ابن ابی طالبؑ کے بیٹے حسینؑ ابن علیؑ کو اپنی خدمات پیش کرنا چاہتے تھے۔

کوفے کے مسلمانوں کا دوسرا گروہ ایسے دین دار مسلمانوں پر مشتمل تھا جو حکومت کے ہاتھوں اسلامی تعلیمات اور قرآن و حدیث کو مسخ ہوتے دیکھتا رہا تھا اور طاقت نہ ہونے کے سبب حالات کی تبدیلی کا منتظر تھا۔

مسلمانوں کا یہ گروہ دہشت گردوں کے ہاتھوں اغوا ہونے والے اسلام کو آزاد کرانے کے لیے بے چین تھا۔ یہ لوگ خلوص دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اس وقت حکومت اسلامی کی سربراہی کا حق صرف اور صرف حسینؑ ابنِ علیؑ کو حاصل ہے جن کا نام ائمہ اسلامؑ کی اس فہرست میں شامل تھا جس کے بارے میں رسول اسلامؐ اپنی زندگی میں بار بار مسلمانوں کو بتاتے رہے تھے۔

امیر شام کے مرنے کے فوراً بعد کوفے میں سیاسی تحریکیں چلنا شروع ہوگئیں اور بنو امیہ کے بادشاہ گر طبقوں نے حکومت کی خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے ان تحریکوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ اسی لیے سخت پابندیوں کے باوجود کوفے

سے بارہ ہزار خطوط امام حسین علیہ السلام تک جانے دیے گئے۔ سخت نگرانی کے باوجود سفیر حسینؑ مسلم بن عقیلؑ کو کوفے میں آنے دیا گیا اور جب مسلم بن عقیلؑ اور امام حسینؑ کے بااعتماد ساتھیوں نے امام حسینؑ کو اطمینان بھرا خط لکھا تو اس خط کے کوفے سے نکلنے کے فوراً بعد کوفے کی انتظامیہ نے کوفے کو سیل کر دیا۔ جگہ جگہ چیک پوسٹیں اور فوجی چوکیاں قائم ہوگئیں اور کوفے کے گورنر نعمان بن بشیر کو معطل کر کے بصرہ کے ظالم و سفاک گورنر عبید اللہ ابن زیاد کو اس شہر کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

عمر ابن سعد کوفے ہی میں موجود تھا اور اپنی درخواست پر حکومت کے احکامات صادر ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کوفے کے نئے گورنر نے کوفے کا چارج سنبھالا تو عمر ابن سعد کی درخواست بھی اس کے ذہن میں تھی اور اس کی قیمت بھی۔ اس نے عمر ابن سعد کو دربار میں طلب کیا اور اس سے کہا۔ ''تم نے امیر المومنین معاویہ ابن ابوسفیان کو ایک درخواست دی تھی؟''

''جی ہاں..... جی ہاں.....!'' عمر ابن سعد کے لہجے میں حیرت، امید اور خوشی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''امیر المومنین یزید ابن معاویہ تمہاری اس درخواست پر غور کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں ان سے بھرپور سفارش کروں گا۔'' ابن زیاد نے بڑی مکاری کے ساتھ کہا۔

''یہ آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔'' چھ ہزار حدیثوں کا حافظ اور قاری قرآن مال و حکومت کو آتے دیکھ کر برف کی طرح پگھلنے لگا۔

''اچھا سنو! تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔'' ابن زیاد بولا۔

''آپ جیسے محسنوں کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔'' عمر ابن سعد پالتو کتے کی طرح دُم ہلانے لگا۔

''میری سواری کا خاص گھوڑا باہر موجود ہے۔ فی الحال ایک ہزار فوجی تمہارے ماتحت ہوں گے۔ وقت ضرورت حکومت کی ساری فوج تمہارے پیچھے کھڑی ہوگی۔'' ابن زیاد

بولا۔

''میرے لیے اتنا بڑا اعزاز....'' عمر ابن سعد اپنی قیمت وصول کرنے سے پہلے ہی بک چکا تھا اور اب غلاموں کی طرح جھکا جا رہا تھا۔

''یہ فوجی لشکر لے کر تم کربلا کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ باقی فوجی دستے تمہارے پیچھے پیچھے روانہ ہو رہے ہیں۔'' ابن زیاد نے کہا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟'' عمر ابن سعد نے سوال کیا۔

''تمہیں اس بغاوت کو ختم کرنا ہوگا جس کے آثار اِن دنوں کوفے میں نظر آ رہے ہیں۔ حسینؑ ابن علیؑ کا رخ کربلا کی جانب ہے۔ تم وہاں پہنچ کر حسینؑ ابن علیؑ سے امیر المومنین یزید بن معاویہ کی بیعت طلب کرو۔ اگر وہ تیار ہو جائیں تو انہیں گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔ حسینؑ بیعت سے انکار کریں تو انہیں اور ان کا ساتھ دینے والوں کو موت کی گھاٹ اتار دو۔''

عمر ابن سعد لرز کر رہ گیا۔ رے کی حکومت کی یہ قیمت ادا کرنا پڑے گی! یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ''نواسۂ رسولؐ کو قتل کر دوں....'' اس نے حیرت سے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''نہ کرو میں یہ اہم ذمے داری کسی اور کے سپرد کر دوں گا اور رے کی حکومت بھی جس کے خواب تم مدتوں سے دیکھ رہے ہو۔'' ابن زیاد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''رے کی حکومت.... نواسۂ رسولؐ کا قتل....'' عمر ابن سعد پل صراط پر کھڑا تھا۔ ایک طرف دنیا کی جنت دوسری طرف ہمیشہ ہمیشہ کا جہنم۔ ''مجھے ایک دن کی مہلت درکار ہے۔'' وہ ابن زیاد کے آگے جھک گیا۔

☆☆☆

اگلے دن دنیا جیت گئی۔ رسول اللہؐ کی سیکڑوں حدیثیں رات بھر فریاد کرتی رہیں، رات بھر قرآن کی آیتیں اسے حق کی طرف بلاتی رہیں لیکن صبح ہونے سے پہلے پہلے عمر ابن

سعد نے اپنے سارے علم، رسول اللہؐ کی احادیث اور قرآن کے احکامات کو اپنے دماغ سے کھرچ ڈالا۔ اس لیے کہ مال و دولت اور حکومت و اقتدار اسے سامنے نظر آ رہا تھا، آخرت ابھی دور کی چیز تھی۔ شیطان نے اس سے سرگوشی کی۔ ''اللہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ بعد میں توبہ کر لینا وہ تمہیں بھی معاف کر دے گا''

اس طرح وہ خالص شیطان کا بندہ بن کر شیطان کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ ابن زیاد کا گھوڑا حاضر تھا۔ فوجی دستہ تیار کھڑا تھا۔ عمر ابن سعد نے نواسۂ رسولؐ کے قاتلوں کی کمان سنبھالی اور کربلا کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں حسینؑ ابن علیؑ دریائے فرات کے کنارے خیمہ زن تھے۔ عمر سعد کی پہلی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ کربلا پہنچ کر نواسۂ رسولؐ خاندان اہل بیتؑ اور ان کے ساتھ دینے والے بوڑھوں، جوانوں، بچوں اور خواتین پر پانی بند کر دے۔

کوفے سے کربلا کے راستے تک عمر ابن سعد کا ضمیر اسے کچوکے دیتا رہا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے؟ نواسۂ رسولؐ پر پانی بند کرنا، انہیں قتل کرنا معمولی گناہ نہیں۔ یہ گناہان کبیرہ سے بھی بڑھ کر ایک غیر معمولی، نا قابل معافی، نا قابل تلافی گناہ ہے۔

یہ سوچتے سوچتے ایک لمحے کو اسے جھرجھری سی آ جاتی لیکن فوراً ہی شیطان اسے تھپکیاں دینے لگتا۔ رے کی حکومت کا حسین تصور، اقتدار اور مال و دولت کا نشہ اُس کی آنکھوں کو بند کر دیتا۔

اسی ذہنی کشمکش سے تنگ آ کر عمر سعد نے اب ایسی ترکیبیں سوچنا شروع کر دی تھیں کہ کوفے کا سفاک گورنر کسی طرح نرم پڑ جائے، یا نواسۂ رسولؐ اپنے رویے میں لچک پیدا کر لیں اور کسی طرح ایسا ہو کہ یہ جنگ نہ ہو۔ کسی طرح وہ نواسۂ رسولؐ کے قتل سے بھی بچ جائے اور ابن زیاد کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے تا کہ وہ گناہ عظیم سے بچ کر بنی امیہ سے رے کی حکومت کا پروانہ حاصل کر سکے۔

کربلا پہنچنے کے فوراً بعد اس نے سفارتی کوششیں شروع کر دیں اور انہی کوششوں

کے نتیجے میں رات کی تاریکی اور ستاروں کی مدہم روشنی میں کھلے آسمان کے نیچے کھلے میدان میں وہ نواسۂ رسولؐ کے سامنے بیٹھا تھا۔ دونوں طرف کے حفاظتی دستے ذرا فاصلے پر چاق و چوبند کھڑے تھے۔ امام عالی مقامؑ کے ہمراہ ان کے بیٹے علی اکبرؑ اور چھوٹے بھائی ابوالفضل العباسؑ تھے اور عمر ابن سعد اپنے بیٹے اور غلام کے ساتھ بیٹھا تھا۔

گفتگو کا آغاز نواسۂ رسولؐ کی جانب سے ہوا۔ آپؑ نے عمر سعد کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''سعد کے بیٹے! کیا تم مجھ سے جنگ کرو گے! تم جانتے ہو کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ کیا تمہیں اس خدا کا بھی خوف نہیں جس کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ حق و باطل کی اس جنگ میں تم ہمارا ساتھ دو اور اللہ کی قربت حاصل کرو؟'' امام حسین علیہ السلام اپنے نانا رسول اللہؐ اور اپنے والد علیؑ ابن ابی طالبؑ کی سیرت کے مطابق گناہوں سے روکنے برائیوں سے باز آنے اور نیکی کی دعوت دینے کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

''یا بن رسول اللہ! اگر میں نے حکومت کا ساتھ نہ دیا تو میرا گھر جلا دیا جائے گا۔'' عمر ابن سعد بولا۔

''میں تمہیں نیا مکان بنوادوں گا۔'' امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔

''وہ لوگ میرا مال و دولت چھین لیں گے۔'' عمر ابن سعد نے دوسرا بہانہ بنایا۔

''میں اس کے بدلے میں بہت بڑی زرعی زمین تمہیں دے دوں گا جس میں کھیت بھی ہیں اور کھجوروں کے باغات بھی۔ معاویہ ابن ابوسفیان اس زمین کو دس لاکھ دینار میں خریدنا چاہتا تھا مگر یہ زمین میں نے اسے فروخت نہیں کی۔''

''ابن زیاد کوفے میں میرے سارے خاندان کو قتل کر ڈالے گا'' عمر ابن سعد نے جواب دیا۔ وہ اس عارضی زندگی کے لیے پریشان تھا اور اس موت سے ڈر رہا تھا جو کسی کے قتل کیے بغیر بھی اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے والی تھی۔

اس پر حجت تمام کرنے کے بعد امام عالی مقام سمجھ گئے کہ یہ اپنا راستہ نہیں بدلے گا۔

جان و مال کا خوف تو محض ایک بہانہ تھا دراصل وہ آنے والے سنہرے دنوں کے خوابوں میں گرفتار تھا۔

امام حسین علیہ السلام اٹھ کھڑے ہوئے اور اٹھتے اٹھتے اس سے کہا۔ ''تم مجھے قتل کرنے کو تیار ہو اور یہ سمجھ رہے ہو کہ ابن زیاد تمہیں رے اور گرگان کی حکومت دے دے گا لیکن خدا کی قسم یہ حکومت تمہیں نصیب نہیں ہوگی۔ یہ تو ایک عہد ہے جو مجھ سے کیا گیا ہے۔ اب تم جو چاہے کرو لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کوفے میں تمہارا سر نیزے پر پھرایا جا رہا ہے اور بچے اس پر پتھر مار رہے ہیں۔''

☆☆☆

عمر ابن سعد یہ باتیں سن کر لرز گیا تھا لیکن وہ دنیاوی مال و دولت کے لالچ کی وجہ سے یزیدی لشکر کی سپہ سالاری چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ آخر اس نے کوفے کے گورنر کو ٹھنڈا کرنے اور جنگ روکنے کی ایک اور کوشش کی۔ جنگ روکنے کی کوشش وہ اس لیے کر رہا تھا کہ وہ نواسۂ رسولؐ کے قتل جیسے گناہ سے بھی بچ جائے اور حکومت کی نظروں میں بھی سرخرو رہے۔

اس نے کوفے کے گورنر عبید اللہ ابن زیادہ کو خط لکھ کر میدانِ جنگ کی تازہ ترین رپورٹ روانہ کی اور اسی خط میں اس نے امام حسین علیہ السلام کی طرف سے کچھ ایسی باتیں لکھ دیں جو نہ امام علیہ السلام نے کی تھیں اور نہ امام عالی مقامؑ کی شخصیت سے ان باتوں کا تصور کیا جا سکتا تھا۔

اس نے ابن زیادہ کو خط لکھا:

''خداوند تعالیٰ فتنے کی آگ کو ٹھنڈا کرے اور اُمت میں اتحاد پیدا کرے۔ میں نے حسینؑ ابن علیؑ سے بات کی ہے۔ وہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات چاہتے ہیں۔

پہلی یہ کہ حسینؑ کہتے ہیں کہ مجھے یہاں سے واپس جانے دیا جائے

تا کہ میں اپنی باقی عمر اپنے ناناؐ کے روضے پر عبادت کر کے گزار دوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انہیں کسی محاذ جنگ پر بھیج دیا جائے تا کہ وہ کافروں سے لڑ کر جامِ شہادت نوش فرمائیں۔

حسینؑ کی تیسری خواہش ہے کہ انہیں امیر المومنین یزید ابن معاویہ کے پاس شام روانہ کر دیا جائے تا کہ وہ یزید سے خود بات کر سکیں۔"

عمر ابن سعد نے جو باتیں امام علیہ السلام سے منسوب کر کے ابن زیاد کو لکھیں وہ خود اس کے ذہن کی پیداوار تھیں لیکن بہت سے مورخین نے بغیر غور و فکر کیے انہیں حقیقت میں امام علیہ السلام کی خواہش کے طور پر اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

یہ باتیں نہ امام عالی مقامؑ کے ارادوں اور منصوبوں سے میل کھاتی ہیں اور نہ ان بے شمار پیش گوئیوں سے جو اللہ کے رسولؐ، امیر المومنینؑ اور خود سید الشھداء امام حسین علیہ السلام نے واقعہ کربلا اور اپنی شہادت کے بارے میں کی تھیں۔

امام حسین علیہ السلام کو اگر مدینے واپس جانا ہوتا تو آپ مدینہ چھوڑ کر کربلا کیوں تشریف لاتے۔

یزید کو براہِ راست بات کرنے کے لائق سمجھتے تو مدینے سے براہ راست شام تشریف لے جاتے۔

جہاں تک یہ خیال کہ امام علیہ السلام نے کسی محاذ جنگ پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس سے بڑا جھوٹ عمر سعد بول نہیں سکتا تھا۔ اس وقت کسی محاذ پر نہ عیسائیوں سے جنگ ہو رہی تھی نہ یہودیوں سے۔

اور کیا نواسۂ رسولؐ سے اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ جس ظالم و جابر حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کر رہے تھے اسی حکومت کی فوج میں شامل ہو کر اس دشمن اسلام حکومت کو تسلیم کر لیتے!

☆☆☆

یہ خط ابن زیادہ کو ملا تو شمر ذی الجوشن اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ابن زیاد نے شمر کے مشورے سے عمر ابن سعد کو جواب لکھا۔

''میں نے تمہیں حسینؑ ابن علیؑ کے پاس اس لیے نہیں بھیجا کہ تم انہیں مصیبتوں سے بچانے کی ترکیبیں سوچنے لگو، معاملے کو لمبا کرو اور انہیں سلامتی و رہائی کی امید دلاؤ۔ سنو! اگر حسینؑ اور ان کے ساتھی میرے حکم پر عمل درآمد کے لیے تیار ہیں تو انہیں میرے پاس روانہ کردو۔ اگر وہ بیعت سے انکار کررہے ہیں تو ان پر حملہ کرکے سب کو قتل کردو اور ان کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالو کہ یہ لوگ اسی قابل ہیں۔

اگر تم میرے احکامات ماننے کو تیار ہو تو ٹھیک ورنہ لشکر کی سرداری شمر ذی الجوشن کے حوالے کرکے الگ ہو جاؤ۔''

شمر ذی الجوشن اس خط اور تازہ فوجوں کو لے کر نو محرم کی شام کربلا پہنچا۔ اس نے عمر ابن سعد کو یہ خط پڑھ کر سنایا تو عمر ابن سعد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے شمر سے کہا۔ ''خدا کی قسم تو نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ معاملہ صلح صفائی سے نمٹ جائے۔ خدا تجھے تباہ کرے... خدا کی قسم حسینؑ، ابن زیاد کا حکم ماننے کو کسی صورت تیار نہیں ہوں گے کیوں کہ ان کے اندر ان کے والد کی روح موجود ہے۔''

شمر نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور بولا۔ ''زیادہ باتیں نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ، ابن زیاد کے حکم کے مطابق حسینؑ ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو یا اپنے عہدے سے برطرفی پسند کرتے ہو۔ میں لشکر کی سپہ سالاری سنبھالنے کو تیار ہوں۔''

یہی وہ لمحہ تھا کہ پل صراط پر ڈگمگاتا ہوا صحابی رسول کا بیٹا، چھ ہزار حدیثوں کا حافظ، قرآن کی آیتوں کو دن رات رٹنے والا، شیطان کو اپنے سینے میں بٹھا کر نمازوں میں طویل

سجدے کرنے والا ''عالم دین'' جہنم کے گہرے گڑھوں اور آگ کے بند ستونوں کے اندر گرتا چلا گیا۔ اس نے شمر سے کہا۔ ''نہیں میں لشکر کی سرداری تمہارے سپرد نہیں کروں گا۔ اس کام کو میں خود سرانجام دوں گا۔''

پھر عاشور کے دن یہ عمر سعد ہی تھا جس نے میدان جنگ میں اپنے غلام کو آواز دے کر کہا۔ ''جھنڈا قریب لاؤ۔'' جھنڈا قریب آیا تو اس نے اپنی کمان میں تیر جوڑا اور اسے اصحاب حسینؑ کی طرف پھینکتے ہوئے چیخا۔ ''سب لوگ گواہ رہنا کہ حسینؑ کی طرف پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔''

اور پھر یہ لشکر یزیدی کا سپہ سالار عمر ابن سعد ہی تھا کہ واقعہ کربلا کے بعد ابن زیاد اسے آج کل پر ٹالتا رہا۔ آخر یزید جہنم رسید ہوا۔ کوفے میں مختارِ ثقفی نے انقلاب برپا کر دیا اور عمر ابن سعد دوسرے قاتلانِ حسین کے ساتھ مارا گیا۔ اس کی لاش سڑک پر ڈال دی گئی اور اس کا سر نیزے کی نوک پر لگا کر کوفے کی گلیوں میں گھمایا گیا جہاں بچوں کے غول اس کے منحوس چہرے پر تھوکتے اور اس پر پتھروں کی بارش برساتے رہے۔

نہ اسے عراق کی گندم زیادہ دن نصیب ہوئی نہ کوئی انعام و اکرام حاصل ہوا اور نہ رے کی گورنری جس کے لالچ میں اس نے خود کو اپنے علم اور عالمانہ شخصیت کو شیطان کے ہاتھ بے قیمت فروخت کر ڈالا تھا۔

☆☆☆☆☆

روشنی کی طرف

اس بار حج کے دنوں میں انہوں نے مکے کے اندر کچھ غیر معمولی چہل پہل دیکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس مرتبہ شام کے علاقے سے زیادہ حاجی حج کرنے آئے ہیں۔ مکے کے اندر بھی اس مرتبہ حفاظتی انتظامات پہلے کی نسبت زیادہ نظر آرہے تھے۔

—*****—

خیمے کی طنابیں تیز ہوا سے لرز رہی تھی۔ یہ بڑا مضبوط اور کشادہ سفری خیمہ تھا۔ اندر قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ باہر دوسرے خیمے کے قریب ملازمین کھانا تیار کررہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا لیکن ابھی دھوپ میں تیزی نہیں آئی تھی اس لیے خیمے کے اندر گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہورہا تھا۔ یہ لوگ حج کی ادائیگی سے فارغ ہوکر واپس اپنے گھروں کی طرف جارہے تھے۔

اس بار حج کے دنوں میں انہوں نے مکے کے اندر کچھ غیر معمولی چہل پہل دیکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس مرتبہ شام کے علاقے سے زیادہ حاجی حج کرنے آئے ہیں۔ مکے کے اندر بھی اس مرتبہ حفاظتی انتظامات پہلے کی نسبت زیادہ نظر آرہے تھے لیکن عام حاجیوں کی زیادہ تر توجہ مناسک حج کے مختلف احکام کی ادائیگی پر مرکوز رہی کہ تمام مناسک ٹھیک ٹھیک طریقے سے ادا کیے جاسکیں۔ کیا معلوم آئندہ سال وہ حج کرنے کے لیے آبھی

سکیں یا نہیں۔

شام کے حکمران نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ساری امت مسلمہ سے اپنے بدکردار، شراب خور بیٹے یزید کے لیے بیعت لے لی تھی۔ چند افراد نے بیعت سے انکار کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ انہیں یزید کی بیعت پر راضی کیا جاتا کہ اوپر سے حاکم شام کا بلاوا آ گیا۔ یزید ابن معاویہ نے تخت و تاج سنبھال لیا اور سب سے پہلے اس نے مدینے کے گورنر ولید بن عتبہ کو لکھا کہ ان لوگوں سے بیعت طلب کرو۔ بیعت نہ کرنے والوں میں عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن زبیر اور نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السلام شامل تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی بیعت سے انکار کرنے والوں میں شامل تھے لیکن انہیں مدینے اور مکے کے درمیان پراسرار طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا جاچکا تھا۔

یزید کو سب سے پہلے اور فوری طور پر حسینؑ ابن علیؑ کی بیعت درکار تھی۔ باقی افراد پر بیعت کا دباؤ دکھاوے کا تھا۔ اصل زور اس بات پر تھا کہ حسینؑ ابن علیؑ سے بیعت طلب کی جائے اور وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر کاٹ کر یزید کو روانہ کردیا جائے!

امام حسینؑ کے سامنے جب بیعت کا سوال رکھا گیا تو آپؑ نے گورنر مدینہ سے کہا کہ تم سب مدینے والوں کو جمع کرلو اور بیعت کی بات کرو اس وقت دیکھیں گے۔ اس کے بعد آپؑ نے فوری طور پر مدینہ چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ بیعت سے انکار کے بعد آپ اگر مدینے میں رکے تو یزیدی لشکر شہر پر حملہ کر کے تمام بنی ہاشم کو قتل کرڈالے گا اور دنیا کو یہ بتایا جائے گا کہ حاکم شام کے مرتے ہی حسینؑ ابن علیؑ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گورنر ہاؤس پر حملہ کیا اور جوابی کارروائی میں تمام حملہ آوروں کو مار دیا گیا۔

آپؑ امام وقت تھے۔ دشمنان اسلام کی سازشوں سے آگاہ اور ان کی شیطانی سازشوں کو ناکام بنانے کی خدائی طاقتوں سے لیس۔ اسی لیے آپؑ نے مدینے سے نکل کر مکہ معظمہ میں پناہ لے لی۔

شیطانی طاقتیں اپنی چال چل رہی تھیں۔ نواسۂ رسولؐ کے خون کے پیاسے شام سے

حاجیوں کے روپ میں مکہ معظّمہ پہنچ چکے تھے کہ حج کے طواف کے دوران نواسۂ رسولؐ پر زہریلے خنجر سے حملہ کردیا جائے اور قاتل ہجوم میں غائب ہوجائے۔

اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوجاتا تو اس کے نتیجے میں شام کا ظالم و جابر حکمران نواسۂ رسولؐ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے خلافت کے دوسرے دعوے داروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

اگر ایسا ہوجاتا تو آج ساری دنیا یزید ابن معاویہ کی تعریف کررہی ہوتی کہ اس نے امام مظلومؑ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ اس طرح دین اسلام کے دشمن، دین اسلام کے ہیرو بن جاتے اور دینِ اسلام کو ہائی جیک کرنے کا سفیانی منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوجاتا۔

لیکن امام حسین علیہ السلام دشمن کی سازشوں سے آگاہ اور ان سازشوں کی جڑیں کاٹنے کی خدائی صلاحیتوں سے پوری طرح لیس تھے اسی لیے حج سے ٹھیک ایک دن پہلے آپ مکہ معظّمہ کی حدود سے باہر نکل آئے اور عراق کی سمت روانہ ہوگئے جہاں کے رہنے والے امام علیہ السلام کو ہزاروں خط لکھ چکے تھے کہ ہمارا کوئی امام نہیں آپؑ یہاں آجائیں ہم آپ کیساتھ ہیں۔

☆☆☆

وہ شاندار خیمہ صحرا میں دور ہی سے نظر آتا تھا۔ اس کشادہ خیمے کے اندر قالین بچھے ہوئے تھے۔ ملازمین کھانا تیار کرچکے تھے۔ اب خاندان کے افراد جو حج سے واپس جارہے تھے اس وقت دسترخوان پر بیٹھے کھانا کھارہے تھے کہ باہر سے ایک ملازم اندر آیا۔ ”ایک پیغام بر آپ سے ملنا چاہتا ہے“۔ اس نے سربراہ خاندان سے مخاطب ہوکر کہا۔

”کس کا قاصد ہے؟“ خاندان کے سربراہ زہیر ابن قینؒ نے سوال کیا۔

”وہ حسینؑ ابن علیؑ کا قاصد ہے“۔ ملازم نے بتایا۔

”حسینؑ... ابن علیؑ....“ زہیر قینؒ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ

کھڑے ہوئے۔ ''حسینؑ ابن علیؑ....'' انہوں نے زیرلب کہا۔ ''بلاؤ اندر بلاؤ''۔ انہوں نے ملازم کو حکم دیا۔

زہیر ابن قینؓ کوفے کے رہنے والے تھے۔ بلا کے بہادر، نیک اور شریف آدمی تھے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں منافقین اسلام کی سازشوں کی وجہ سے اس وقت کے مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک گروہ کو عثمانی اور دوسرے کو علوی کہا جاتا تھا۔ زہیر بن قینؓ عثمانی گروہ سے تعلق رکھتے تھے آج کی زبان میں زہیر قینؓ اس وقت کے اہل سنت مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے۔ لیکن خاندان اہل بیتؑ خصوصاً حضرت امام حسینؑ کی عظمت کے دل سے قائل تھے۔

انہیں معلوم تھا کہ نواسۂ رسول حج سے ایک دن پہلے مکے سے نکلے ہیں اور انہی راستوں پر سفر کر رہے ہیں جن راستوں سے زہیر ابن قینؓ کوفے کی طرف واپس جا رہے تھے۔ راستے میں انہیں حسینؑ ابن علیؑ کا قافلہ نظر بھی آیا تھا لیکن زہیر ابن قینؓ قافلۂ حسینی سے دور دور رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ نواسۂ رسول سے جا کر ملے اور حسینؑ نے ان سے کچھ کہا تو پھر وہ نواسۂ رسولؐ کا ساتھ دینے سے انکار نہیں کر سکیں گے۔

خیمے کا پردہ ہٹا اور ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اسے آتے دیکھ کر زہیر ابن قینؓ اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ ان کی بیوی خیمے کے دوسرے کونے کی طرف چلی گئیں۔ ''میں ابو عبداللہ حسینؑ ابن علیؑ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔'' آنے والے نوجوان نے کھڑے کھڑے کہا۔

زہیر ابن قینؓ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ ''کیا حکم ہے میرے لیے؟'' ان کی آواز انجانے اندیشوں کے سبب بدلی ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کو ان کی بیوی نے بھی محسوس کیا۔ زہیر گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

''نواسۂ رسولؐ آپ کو طلب فرما رہے ہیں۔'' آنے والے قاصد نے مصافحہ کرتے ہوئے انہیں بتایا۔

زہیر ابن قینؓ کے اندیشے سامنے آ گئے تھے۔ انہیں چپ سی لگ گئی۔ زہیرؓ کو جواب دینے میں ذرا سی دیر ہوئی تو اُن کی شریکِ حیات نے اُسے محسوس کر لیا، وہ اٹھ کر ان کے قریب آئیں۔ ''سبحان اللہ ! فرزند رسولؐ تمہیں بلائیں اور تم جانے میں پس و پیش کرو.... سبحان اللہ''۔ ان کی بیوی دُلہم بنت عمرو نے انتہائی دکھ اور حیرت کے ساتھ کہا۔

''ارے تم جا کر دیکھو تو سہی کہ فرزند رسولؐ تم سے کیا کہتے ہیں؟''

''ہاں ہاں! میں جا رہا ہوں۔'' زہیرؓ نے اپنے ہاتھ کپڑے سے صاف کیے اور اسی طرح قاصد حسینؑ کے ساتھ خیمے سے نکل پڑے۔

پھر جب وہ اپنے خیمے میں واپس آئے تو ایک بدلے ہوئے انسان تھے۔ نواسۂ رسولؐ نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب کون سی طاقت انہیں راہ سے بے راہ کر سکتی تھی۔ آتے ہی انہوں نے اپنے ملازمین سے کہا۔ ''یہ خیمہ یہاں سے اکھاڑو اور تمام سامان قافلہ حسینی کی طرف پہنچا دو۔ جلدی کرو۔ یہ خیمہ نواسۂ رسولؐ کے خیموں کے ساتھ لگاؤ۔''

ان کی بیوی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا لیکن زہیرؓ نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ''بنت عمرو! آگے نہ جانے کیا حالات پیش آئیں اس لیے میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں تم اپنے عزیزوں کے ساتھ وطن لوٹ جاؤ۔ میں نے حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ جینے مرنے کا عہد کر لیا ہے۔ ان کا راستہ اللہ کی راہ میں اپنی قربانی پیش کرنا ہے اور میں اپنی جان نواسۂ رسولؐ پر قربان کرنے کا عزم کر چکا ہوں۔'' ان کی آواز میں گہرا دکھ بھی تھا اور بے پناہ خوشی بھی۔

زہیرؓ کی بیوی کے ماتھے پر ایک شکن آئی اور فوراً ہی مٹ گئی۔ ''اللہ آپ کا حافظ و مددگار ہے۔ اللہ آپ کو مبارک کرے لیکن قیامت کے دن امام حسینؑ کے ناناؐ کی خدمت میں میرے اس جذبے کا ذکر ضرور کیجیے گا۔'' بنت عمرو نے کہا اور خیمے کے دوسری طرف چلی گئی جہاں ان کا بھائی موجود تھا۔

اس طرح مقام زرود پر زہیر قینؓ قافلۂ حسینی کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اللہ کو ان کی کوئی نیکی پسند آ گئی تھی کہ انہیں جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کی راہوں پر گامزن کر دیا۔

☆☆☆

ذوحسم نامی منزل پر جب حُر بن یزید ریاحی نے قافلہ حسینی کا راستہ روکا تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے سامنے ایک تقریر فرمائی۔ آپؑ نے کہا۔

''صورتِ حال تمہارے سامنے ہے۔ دنیا کا رنگ بدل چکا ہے۔ نیکی رخصت ہو چکی ہے۔ پست زندگی ایک زہریلی گھاس کی مانند ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں کیا جاتا اور باطل سے لوگ دور نہیں ہٹتے۔ اس صورتِ حال میں مومن یقیناً اللہ سے ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ان ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا وبال جان اور شہادت ایک نعمت ہے''۔

یہ زہیر قینؓ ہی تھے جو اس خطبے کو سن کر آگے بڑھے اور تمام اصحاب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے آپؑ کے ارشاد کو سنا۔ خدا کی قسم اگر یہ دنیا ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی اور آپؑ کا ساتھ دینے کے لیے ہمیں دنیا کو چھوڑنا ہوتا تب بھی ہم اسے چھوڑ کر آپؑ کا ساتھ دینے کو پسند کرتے''۔

زہیرؓ حق و باطل اور خیر و شر کی کش مکش سے باہر نکل آئے تھے۔ حسینؑ ابن علیؑ نے انہیں ہر قسم کے شک و شبہ سے نکال کر مکمل یقین کے راستے پر گامزن کر دیا تھا۔ ان کی تقریر سن کر امام عالی مقامؑ نے انہیں دعائے خیر سے نوازا۔

نو محرم کی شب جب شمر ملعون خیمہ حسینی پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا تو سید الشہداء نے اپنے علمدار حضرت عباسؑ کے ساتھ بیس سواروں کو لشکر یزید سے بات کرنے کے لیے بھیجا۔ اس وفد میں حبیب ابن مظاہرؓ، اور زہیر قینؓ بھی شامل تھے۔ وہاں جب ایک دشمن اہل بیتؑ نے حبیب ابن مظاہرؓ پر طنز کیا تو زہیر قینؓ کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے طنز کرنے والے کو سخت جواب دیا۔ اس پر اس شخص نے زہیر ابن قینؓ کو جواب دیا۔ ''زہیر! تم تو اس

گھرانے کے شیعوں میں نہیں تھے! تم تو عثمانی گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔"

زہیرؒ نے جواب دیا۔ "ہاں میں اس گھرانے کا شیعہ نہیں تھا لیکن میں نے تمہاری طرح حسینؑ ابن علیؑ کو نہ خط لکھے، نہ ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا، لیکن جب میں نے حسینؑ کو راستے میں دیکھا تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد آ گئے۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسینؑ کا رشتہ یاد آیا اور جب میں نے دیکھا کہ رسولؐ کا نواسہ مصیبتوں میں گرفتار ہے تو میں نے ان کا ساتھ دینے کا عہد کرلیا۔ خدا اور رسولؐ کے اس حق کی خاطر جسے تم لوگ بھلا چکے ہو۔" یہ جواب سن کر اس نام نہاد مسلمان کو چپ لگ گئی۔

شب عاشور جب امام عالی مقامؑ نے تمام اصحاب سے اپنی بیعت اٹھائی اور چراغ بجھا کر کہا کہ جو شخص یہاں سے جانا چاہے وہ جا سکتا ہے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد جب چراغ دوبارہ روشن کیا گیا تو جن اصحاب نے جوش ایمانی سے بھرپور تقریریں کی ان اصحاب میں زہیر ابن قینؒ بھی شامل تھے۔ اس وقت آپ نے امام عالی مقامؑ سے عرض کی:

"خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ آپؑ اور خاندان رسولؐ کے دوسرے افراد کی زندگی بچ جائے اس کے بدلے چاہے ہمیں بار بار قتل اور بار بار زندہ ہو کر دوبارہ قتل ہونا پڑے"۔

صبح عاشورہ امام عالی مقامؑ نے اپنے مختصر ساتھیوں کے ساتھ جنگی حکمت عملی تیار کی تو زہیر ابن قینؒ کو میمنہ کا افسر مقرر کیا۔ جنگ کے آثار رونما ہوئے تو زہیر قینؒ میدان میں نکلے آپ گھوڑے پر سوار تھے اور سر سے پاؤں تک اسلحہ جنگ سے آراستہ نظر آ رہے تھے۔ میدان میں جا کر انہوں نے لشکر یزید کو اس طرح مخاطب کیا۔

> "اللہ تعالی نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہمارا اور تمہارا امتحان لیا ہے تا کہ وہ دیکھے کہ ان کے لیے تم کیا کرتے ہو اور ہم کیا کرتے ہیں۔ خدارا محمدؐ کے اہل بیتؑ کی مدد کے لیے آگے بڑھو اور اس سرکش انسان ابن زیاد کو چھوڑ دو۔

ابن زیاد اور اس کے باپ سے تمہیں کیا ملا؟ یہ بنو امیہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے رہے۔ تمہارے ہاتھ پیر کاٹتے رہے۔ تمہیں پھانسیوں پر چڑھاتے رہے اور تمہارے بہترین افراد (مثلاً) حجر ابن عدیؓ اور ہانی بن عروہؓ جیسے لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں''۔

یزیدی فوج کو کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ زہیرؓ کو برا بھلا کہنے پر اتر آئے۔ ایک کوفی نے چیخ کر کہا۔ ''ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک تمہارے سردار حسینؑ ابن علیؑ کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے سامنے پیش نہ کر دیں''۔

زہیرؓ اس پر بھی خاموش نہ ہوئے۔ وہ ان گمراہوں کو نصیحتیں کرتے رہے۔ آخر شمر نے ان کی طرف ایک تیر چلایا اور بولا۔ ''بس خاموش ہو جاؤ''۔

زہیر قینؓ نے خود کو تیر سے بچایا اور غصے میں گرج کر کہا۔ ''میں تجھ جیسے جاہل سے تو بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ تیرے لیے تو جہنم کے عذاب کی خوش خبری ہی کافی ہے''۔

''فکر نہ کرو تم اور تمہارا سردار بہت جلد قتل ہونے والا ہے۔'' شمر نے درندگی سے کہا۔

یہ سن کر زہیر ابن قینؓ نے اسے زور سے ڈانٹا۔ ''ذلیل انسان! تو مجھے موت سے ڈرانا چاہتا ہے! خدا کی قسم حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ مرنا مجھے تمہارے ساتھ ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے سے زیادہ پسند ہے''۔

امام عالی مقامؑ ذرا فاصلے سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ آپؑ نے کسی صحابی کے ذریعے زہیر ابن قینؓ کو واپس بلالیا اور اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ ''جس طرح مومن آل فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کی تھی اور انہیں حق کی طرف آنے کی دعوت دی تھی اسی طرح تم نے بھی اس فرض کو بہ خوبی سرانجام دیا۔ زہیر! تم نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا''۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ لشکرِ یزیدی نے خیمہ حسینی پر یلغار شروع کر دی۔ یہ حملہ اتنا

شدید تھا کہ فوجِ حسینی کے پچاس جانثار دشمن کا مقابلہ کرتے کرتے شہید ہو گئے۔ اس دوران شمر ملعون امام عالی مقامؑ کے مخصوص خیمے تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنا نیزہ خیمے کے اوپر مارا اور زور سے چیخا۔ ''آگ لے آؤ، آگ لے آؤ۔ میں اس خیمے اور اس کے اندر تمام لوگوں کو نذرِ آتش کر دوں گا۔''

یہ جملہ کبھی سن گیارہ ہجری میں مدینے میں فاطمہ زہراؑ کے گھر کے سامنے گونجا تھا اور آج پچاس سال بعد میدانِ کربلا میں اس کی بازگشت صاف سنائی دے رہی تھی!

زہیر ابن قینؓ کے کانوں تک یہ آواز پہنچی تو وہ جنگ کرتے کرتے اس طرف کو پلٹے اور دس ساتھیوں کے ساتھ شمر کے فوجی دستے پر حملہ آور ہو گئے۔ ان کا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ شمر کو جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ بہ مشکل جان بچا کر بھاگا۔ زہیر ابن قینؓ نے آگے بڑھ کر اس کے بہت قریبی ساتھی ابوعزہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس عرصے میں نمازِ ظہر کا وقت آ گیا۔ اس وقت امام عالی مقامؑ نے زہیر قینؓ اور سعید بن عبداللہ حنفیؓ سے کہا: ''تم لوگ نماز کے لیے مدد کرو۔ میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔'' یہ سن کر یہ دونوں بہادر امام عالی مقامؑ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے اور امام عالی مقامؑ نے دوسرے اصحاب کے ساتھ نمازِ خوف ادا کی۔

نمازِ جماعت دیکھ کر دشمنوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسی نماز اور اسی امام کو مٹانے کے لیے تو یہاں آئے تھے۔ انھوں نے نمازِ جماعت کی طرف تیر برسانے شروع کر دیے۔ زہیر ابن قینؓ اور سعید ابن عبداللہؓ ان تیروں کو اپنی ڈھالوں سے روکتے رہے، اپنے جسموں کو امامؑ کے لیے ڈھال بناتے رہے۔ سعید ابن عبداللہؓ، تیروں کے زخم کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑے اور ان کی روح عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

اس کے بعد زہیر ابن قینؓ جنگ کے لیے میدان میں آئے۔ وہ تیروں سے پہلے ہی زخمی ہو چکے تھے لیکن موت اب ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انھوں نے تنہا لشکرِ یزید پر حملہ کیا۔ آپ تلوار چلا رہے تھے اور والہانہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''میں زہیر ہوں، قین کا بیٹا۔ میں اپنی تلوار سے ان دشمنوں کو حسینؑ
سے دور کرتا رہوں گا۔''

یہ کہتے کہتے وہ لشکرِ یزید کے سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔ آخر کثیر بن عبداللہ شعبی اور دوسرے دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں زخمی ہوکر گھوڑے سے گرے تو اللہ کی رحمت نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان کی روح جنت الفردوس میں حسینؑ کے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئی۔

☆☆☆

جنگ سے پہلے ہار

حر کا ایک بازو حضرت عباسؑ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرا بازو حضرت علی اکبرؑ نے پکڑ رکھا تھا اور یزیدی لشکر کے ہزار سپاہیوں کا سردار مجرموں کی طرح ہاتھ باندھے امام حسین علیہ السلام کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

—*****—

کئی راتوں سے اس کی آنکھوں کی نیند غائب تھی۔ وہ رات بھر انگاروں پر لوٹتا رہتا۔ تھک ہار کر کبھی لمحے دو لمحے کو آنکھ لگتی تو صحرا کے دوسری طرف لگے ہوئے خیموں سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں اسے اٹھا کر بٹھا دیتیں۔ یہ آوازیں وہ دو راتوں سے سن رہا تھا۔ دن کے شور میں تو یہ آوازیں دب جاتیں لیکن جیسے جیسے رات کا سناٹا گہرا ہونے لگتا روح کو تڑپانے والی ان آوازوں کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھ انہی آوازوں سے کھلی تھی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

حر ابن یزید ریاحی نے خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا۔ دس محرم کی رات گزر رہی تھی۔ ابھی صبح ہونے میں دیر تھی۔ شروع کی تاریخوں کا چاند کبھی کا مشرقی افق میں ڈوب چکا تھا۔ باہر دور دور تک گہرا اندھیرا تھا۔ صحرا کے دوسری طرف سے آنے والی ہوا میں کبھی بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگتیں اور کبھی تلاوت قرآن کی گونج سنائی دینے لگتی۔

حر نے خیمے سے نکل کر گہرا سانس لیا۔ اس وقت اسے صحرائی نشیبوں اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ہوا کے جھونکوں میں ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی عورت کی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں بین کی سی کیفیت تھی۔ اس آواز کو سن کر اس کا دل پھٹنے لگا۔

خیمے کا پردہ تیز ہوا سے پھڑ پھڑایا تو اس کی توجہ اس طرف ہوگئی اس نے پردہ اٹھایا اور دوبارہ خیمے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ صحرا کے دوسری طرف سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے رونے اور ''پانی... اماں! پانی!!'' کی آوازیں سنائی دیں۔

''میں ہوں ان بچوں کی پیاس کا ذمے دار....'' حر نے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا۔ ''میں ہی تو نبیؐ کے نواسے کو گھیر کر اس صحرا میں لایا تھا۔ اگر میں ان کا راستہ نہ روکتا تو آج ان کے معصوم بچے اس طرح پیاس سے نہ تڑپ رہے ہوتے.... حسینؑ ابن علیؑ نے تو اپنے پانی کے ذخیرے سے مجھ جیسے دشمن کی جان بچائی تھی اور آج خود ان کے بچے پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہیں... یہ میں نے کیا کیا...'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ بڑا بہادر اور نڈر آدمی تھا اسی لیے اس نے فوج میں نوکری کی تھی۔ وہ خود کو اسلامی حکومت کی فوج کا سپاہی سمجھتا تھا اور اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتا تھا۔ لیکن گزشتہ چند دنوں سے اس نے ایسے منظر دیکھے تھے جنہوں نے اس کی آنکھوں سے بہت سے پردے ہٹا دیئے تھے۔

اسلامی فوج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرے۔ اگر اسلامی فوج خود رسول اسلامؐ کے خاندان سے جنگ کرنا شروع کردے تو اسے اسلامی فوج کیسے کہا جاسکتا ہے! حسینؑ ابن علیؑ صرف رسولِ اسلامؐ کے نواسے ہی نہیں تھے، آپؑ اللہ کی جانب سے نامزد کردہ امام وقتؑ بھی تھے۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا تھا کہ کوئی ان پر انگلی اٹھا سکے۔ ان کی ساری زندگی دینِ اسلام کی خدمت میں صرف ہوئی تھی۔

یزیدی حکومت نے یہ پروپیگنڈا کر رکھا تھا کہ اس کی فوجیں حکومت اسلامی کے ایک باغی سے جنگ کرنے جارہی ہیں۔ لوگ اس پروپیگنڈے کا شکار تھے۔ حر بھی انہی لوگوں

میں شامل تھا جو حکومت اسلامی کے خلاف کوئی بغاوت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اسی جذبے کے ساتھ فوج کا ایک رسالہ لے کر کوفے سے نکلا تھا... کوفے کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد نے اسے حکم دیا تھا کہ حسینؑ کو ہر قیمت پر گرفتار کر کے کوفے لایا جائے۔

اس وقت کوفے میں فوج بھرتی ہو رہی تھی اور اس فوج کو عمر ابن سعد کی سربراہی میں حضرت امام حسینؑ کے قافلے کو ہر طرف سے گھیر کر قتل کر دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس فوج کی تیاری میں ابھی دیر تھی اس لیے ابن زیاد نے حر کو ایک ہزار آزمودہ سپاہی دے کر امام حسین علیہ السلام کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

صحرا کی ریت انگاروں کی طرح جل ہو رہی تھی۔ آسمان سے سورج آگ برسا رہا تھا۔ حر کا فوجی دستہ صحرا میں بھٹک چکا تھا۔ پانی کا ذخیرہ ختم ہوئے بہت دیر گزر چکی تھی۔ پیاس کی شدت سے سپاہیوں کو اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ گھوڑے زبانیں نکالے بری طرح ہانپ رہے تھے۔ پیاس نے حر کی بھی حالت غیر کر دی تھی۔ راستہ ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام ہو کر حر نے اپنے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ اس کا گھوڑا گردن لٹکائے ہانپ رہا تھا۔ کئی فوجی رہے سہے پانی کے قطروں کی امید میں اپنی چھاگلوں کو منہ سے لگائے زبان گیلی کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے لیکن چھاگلیں خالی تھیں اور صحرا میں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔

انہیں اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی کہ اچانک کے کی جانب سے گرد و غبار کے بادل اٹھتے دکھائی دیے، حر کی آنکھیں چمک اٹھیں، گھڑ سواروں کے جسم میں زندگی دوڑ گئی اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

"یہ ضرور حسینؑ ابن علیؑ کا قافلہ ہے!" ایک سپاہی زور سے چیخا۔

"ٹھہر جاؤ... جلدی نہ کرو... انہیں قریب آنے دو..." حر نے اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھتے دیکھا تو چیخ کر کہا۔

تھوڑی دیر میں گرد و غبار کا بادل چھٹنے لگا۔ قافلے کے آثار اب صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ سب سے آگے ایک نوجوان گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں سبز پھریرے والا علم تھا۔ اس نوجوان کو دائیں بائیں سے کئی گھڑ سوار گھیرے ہوئے تھے ان کے پیچھے اور بہت سے گھڑ سوار تھے۔ انہوں نے عماریوں والے اونٹوں کے گرد حلقہ ڈال رکھا تھا۔ ان کے عقب میں بار برداری کے اونٹ تھے۔ ان اونٹوں پر پانی کے مشکیزے لدے ہوئے تھے۔

پانی دیکھ کر حر کے سپاہیوں کی جان میں جان آ گئی۔ اسی وقت حر نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور اپنا گھوڑا سپاہیوں کے آگے لے آیا۔ ''آگے بڑھو۔۔'' اس نے سپاہیوں کو حکم دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ سپاہیوں نے بھی اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور گھوڑے ہنہناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ صحرا میں گرد و غبار کے بگولے اٹھے۔ ان بگولوں کا رخ امام حسین علیہ السلام کے قافلے کی جانب تھا۔

☆☆☆

صحرا میں فوجی دستے کو دیکھ کر قافلہ حسینی کے جاں باز دفاعی انداز میں مستعد اور چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب سے آگے حضرت ابوالفضلؑ العباس پرچم اسلامی کو بلند کیے کسی شیر کی طرح مستعد اور چوکس کھڑے تھے۔ علم کا سبز پھریرا صحرائی ہوا میں تیزی سے پھڑ پھڑا رہا تھا ان کے ذرا پیچھے دوسرے بہادر کھڑے تھے۔ اس قطار کے بعد رسول اسلامؐ کے نواسے امامِ وقت حضرت امام حسینؑ اپنے گھوڑے پر تشریف فرما تھے۔ آپ کے عقب میں خاندان نبوتؐ کی خواتین اور بچوں کی عماریاں تھیں جنہیں بنی ہاشم کے نوجوانوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ سخت گرمی اور لو کی وجہ سے بچے گھبرائے ہوئے تھے۔ عماریوں کے پردے بار بار اُٹھ رہے تھے اور گر رہے تھے۔

جناب زینبؑ بنت علیؑ نے قافلے کو رکتے ہوئے دیکھا تو آپؑ پریشان ہو گئیں۔ آپؑ کے ذہن میں ہزاروں وسوسے تھے۔ وہ بچپن سے سنتی آئی تھیں کہ ان کا بھائی ایک صحرا میں

شہید کر دیا جائے گا۔ وہ امامت کے کاموں کی شریک کار تھیں اور سب جانتی تھیں لیکن صبر و برداشت کی چٹان بنی ہوئی تھی۔ قافلے کو ٹھہرتے ہوئے دیکھا تو ان کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئیں کہ ان کے بھائی کے قافلے کو صحرا میں یزیدی فوجوں نے گھیر لیا ہے۔

حقیقت تو یہی تھی کہ یزیدی فوجیوں نے نواسۂ رسولؐ کے قافلے کا راستہ روک لیا تھا لیکن راستہ روکنے والے یہ فوجی جنگ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ گرمی اور پیاس کی شدت نے ان کے جسموں کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اس وقت نہ انہیں ابن زیادہ کا حکم یاد تھا اور نہ جنگ کی فکر، اس وقت تو خود ان کی اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

وہ گھوڑے دوڑا کر کسی نہ کسی طرح امام حسین علیہ السلام کے قافلے سامنے تو پہنچ گئے تھے لیکن اب ان کے گھوڑوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور ان کی زبانیں منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھیں۔ یہی حالت فوجیوں کی تھی۔ کئی فوجیوں پر تو پیاس کی شدت سے غشی طاری تھی اور وہ گھوڑوں کی گردنوں پر سر نہوڑائے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔ یزیدی فوج کا جو دستہ نواسۂ رسولؐ کا راستہ روکنے نکلا تھا اس وقت نواسۂ رسولؐ کے رحم و کرم پر تھا۔

ان یزیدی فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا بہت آسان تھا۔ اس کے لیے جنگ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ صرف انہیں پانی نہ دیا جاتا تو بھی یہ چند گھنٹوں بعد صحرا میں تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔ قافلۂ حسینی میں شامل کئی اصحاب نے اپنے سردار حضرت امام حسینؑ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اس یزیدی دستے سے یہیں نمٹ لیا جائے لیکن حسینؑ ابن علیؑ امامِ وقت تھے۔ سخی ماں باپ کے سخی بیٹے! آپؑ پیاس سے نڈھال مجبور انسانوں اور جانوروں کو پیاس سے مرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اپنے قاتل کو ٹھنڈا شربت پلانا ان کے گھرانے کی روایت تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؑ جنگ کرنے نہیں نکلے تھے، آپؑ دین اسلام کو بچانے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ پھر آپؑ اسلام کی تعلیمات کو کس طرح فراموش کر سکتے تھے۔

آپؑ نے اپنے ساتھیوں کی بات کو ٹالتے ہوئے قافلے کے علم بردار کو اشارے سے

اپنے قریب بلایا۔ حضرت ابوالفضل عباسؑ نے اپنے گھوڑے کو گھمایا اور امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور ادب سے سر جھکایا... ''عباسؑ، تم ساقی کوثر کے بیٹے ہو... پیاس سے نڈھال ان انسانوں اور جانوروں کے لیے مشکیزوں کے دھانے کھول دو۔''

حضرت ابوالفضل عباسؑ تعمیل حکم کے لیے پلٹے لیکن امام وقتؑ اپنے بھائی کے ماتھے پر آئی ہوئی ایک ہلکی سی شکن دیکھ چکے تھے... ''سنو عباسؑ!'' آپؑ نے آواز دی۔ ''مجھے معلوم ہے یہ میری جان کے دشمن ہیں لیکن اس وقت یہ پیاس سے نڈھال ہیں اور تم جانتے ہی ہو کہ میں گھر سے اس لیے نکلا ہوں کہ دین اسلام اور اس کی تعلیمات کو ہمیشہ کی زندگی دے سکوں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟'' امام حسین علیہ السلام نے پیار سے کہا۔

''جی آقا...! حضرت ابوالفضل عباسؑ نے خوش دلی سے کہا اور پانی کے مشکیزوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی طرف بڑھ گئے...

پھر دیکھتے ہی دیکھتے صحرا میں آب حیات کے چشمے پھوٹ پڑے۔ انسان ہی نہیں جانور تک اچھی طرح سیراب ہو گئے۔ امام حسینؑ کا حکم تھا کہ انسانوں اور جانوروں کو اچھی طرح سیراب کیا جائے۔ گھوڑوں کے سامنے سے پانی کا برتن اس وقت تک نہ اُٹھایا جائے جب تک وہ اچھی طرح سیراب نہ ہو جائیں۔ آپؑ نے یہ بھی فرمایا کہ گھوڑوں کے سموں پر بھی پانی ڈالا جائے کہ اُن کے سُم صحرا کی ریت سے بُری طرح جھلس رہے تھے۔

پانی پینے کے کچھ ہی دیر بعد حر اور اس کے سپاہیوں کے اوسان بحال ہوئے۔ ان کے جسموں میں زندگی آئی تو انہیں اپنی ذمے داری یاد آئی... کوفے کے گورنر عبیداللہ ابن زیاد نے انہیں حکم دیا تھا کہ حسینؑ ابن علیؑ کو گرفتار کر کے دربار کوفہ میں پیش کیا جائے... یہ حکم یاد آتے ہی حر ابنِ یزید ریاحی حضرت امام حسینؑ کے قریب گیا... ''مجھے کوفے کے گورنر نے حکم دیا ہے کہ آپ کو ہر قیمت پر اس کے سامنے پیش کروں۔''

امام حسین علیہ السلام اپنے گھوڑے پر سوار تھے... آپؑ نے اپنے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور کہا... ''اس سے پہلے کہ تم مجھے کوفے لے جاؤ، تم زندہ ہی نہیں رہو گے۔''

حر نے آپؑ کے گھوڑے کی باگ پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی صحرا میں تلواروں کی جھنکار گونج اٹھی۔ امام حسینؑ کے گھوڑے کی لگام پر حر کو ہاتھ ڈالتے دیکھ کر اصحاب حسینؑ غصے سے بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ اپنی تلواریں نیاموں سے نکال لیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی حر کے سپاہی بھی لڑنے کو تیار ہو چکے تھے۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کی طرف دیکھا۔ آپؑ کے چہرے پر بلا کا سکون اور اطمینان تھا۔ اصحاب جو آپؑ کے اشارے کے منتظر تھے آپؑ کے چہرے کے سکون کو دیکھ کر انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں ڈال لیں۔ امام حسین علیہ السلام نے جھک کر گھوڑے کی باگ پر سے حر کا ہاتھ ہٹایا اور کہا۔ ''تیری ماں تیرے غم میں بیٹھے، یہ کیا کرتا ہے؟''

حر نے اپنی ماں کا نام سنا تو غیرت کے مارے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا مگر اس کی آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ ''حسینؑ ابن علیؑ کی ماں کوئی عام عورت نہیں، وہ تو اللہ کے آخری رسولؐ کی بیٹی اور عالمین کی عورتوں کی سردار ہے۔'' اس نے سوچا اور چپ ہو کر رہ گیا۔

''میں آپ سے ایک درخواست کروں گا۔'' خود پر قابو پانے کے بعد حر نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ نہ کوفے کی طرف جائیں اور نہ مدینے کی طرف۔ اسی طرح سفر کرتے رہیں تاکہ اس عرصے میں ابن زیادہ کو خط لکھ کر میں یہ درخواست کرسکوں کہ مجھے اس ذمے داری سے سبکدوش کر دیا جائے۔'' حر کی زندگی میں باخبری کا شاید یہی وہ لمحہ تھا کہ اسے حسین علیہ السلام اور ان کے نانا رسولؐ اللہ اور ان کی ماں فاطمہ زہراؑ کا مرتبہ یاد آیا اور اسے صراطِ مستقیم نظر آنے لگی۔

''ٹھیک ہے ہم کوئی تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔'' امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی قافلہ حسینی نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

حر کا لشکر اُن کے قریب ہی فاصلہ دے کر چل رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ حر امام

حسینؑ کے قریب آیا۔ ''یا اباعبداللہ! خدا کے واسطے اپنی جان بچانے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ نے جنگ کی تو قتل کر دیئے جائیں گے۔''

امام حسین علیہ السلام نے ناگواری کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ ''تو مجھے موت سے ڈراتا ہے! میں اسی طرح آگے بڑھتا رہوں گا۔ بہادر آدمی کے لیے موت باعث ذلت نہیں۔'' امام عالی مقام نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دے کر آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

سفر اسی طرح جاری رہا۔ نماز کا وقت ہوتا تو حر کا لشکر بھی امام حسین علیہ السلام کے پیچھے نماز ادا کرتا۔ امام حسین علیہ السلام کے قافلے میں پانی وافر مقدار میں موجود تھا لیکن اب یہ پانی آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا اس لیے کہ اس پانی سے حر کے لشکر کے ہزار سپاہی اور ان کے گھوڑے اور اونٹ بھی پیاس بجھاتے تھے۔ منزل عذیب گزر چکی تھی جہاں کوفے سے آنے والے لوگوں نے امام علیہ السلام کو کوفے کے حالات سے آگاہ کیا تھا۔

☆☆☆

ایک صبح نماز ختم ہوئی تھی کہ کوفے سے ابن زیادہ کا قاصد حر کے پاس آیا۔ ابن زیاد نے اپنے خط میں حر کو لکھا تھا کہ ابن علیؑ پر سختی کر...... میرا یہ قاصد تیرے ردعمل کو دیکھے گا اور مجھے آ کر بتائے گا۔ حر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو اس خط کے بارے میں بتایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی نئی حکمت عملی اختیار کرتا کہ اچانک ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

امام حسین علیہ السلام گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑا مناسب رفتار سے چل رہا تھا کہ ایک جگہ پہنچ کر وہ خود بہ خود رک گیا۔ امام علیہ السلام نے اس کی گردن تھپتھپائی اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن گھوڑا قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے قدم ریت میں گڑے ہوئے تھے۔ امام علیہ السلام سارا معاملہ سمجھ گئے۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟'' آپ نے بلند آواز سے سوال کیا۔

''یہ غاضریہ ہے۔'' ایک شخص نے بتایا۔

''اس جگہ کا کوئی اور نام بھی ہے۔'' امام نے پوچھا۔

''اسے نینوا بھی کہتے ہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ بھی کوئی نام ہے اس کا؟'' امام نے سوال کیا۔

''اس جگہ کا نام کربلا بھی ہے۔'' ایک دوسرے شخص نے بتایا۔

امام علیہ السلام نے ایک گہرا سانس لیا اور فرمایا۔ ''کربلا... کربلا. کرب و بلا۔'' پھر آپؑ نے اپنے ساتھیوں کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ''سامان اتارو، خیمے لگاؤ... یہی ہماری خواب گاہ ہے۔ ہم قیامت تک یہیں سوئیں گے۔ اسی جگہ ہمارا خون بہایا جائے گا۔ اسی جگہ ہمارے مرد قتل کئے جائیں گے اور ہمارے بچوں کو ذبح کیا جائے گا۔ یہیں ہماری قبریں بنیں گی اور اسی جگہ ہمارے چاہنے والے ہماری زیارت کے لیے آیا کریں گے... نانا رسول اللہؐ نے مجھے یہی بتایا تھا اور یہ ہو کر رہے گا۔''

یہ سن اکسٹھ ہجری کے محرم کی دوسری تاریخ تھی۔ اسی دن سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے امام حسین علیہ السلام نے اس علاقے کے باشندوں کو طلب کیا اور سولہ مربع میل زمین ساٹھ ہزار درہم میں ان سے خرید کر انہیں نقد رقم ادا کی اور پھر اس زمین کو چند شرائط کے ساتھ انہی لوگوں کے نام کر دیا۔ قافلہ حسینی کے خیمے دریائے فرات کے کنارے نصب ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

تین محرم سے کربلا کا میدان یزیدی فوج کی آمد سے گونجنے لگا۔ ہر روز کوفے کی جانب سے نئے فوجی دستے ڈھول تاشوں اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ کربلا میں آتے اور صحرا کے مختلف حصوں میں اپنے خیمے گاڑنا شروع کر دیتے۔ چھٹی محرم تک تیس ہزار سے زیادہ یزیدی فوجی کربلا پہنچ چکے تھے۔ وہ رضا کاران کے علاوہ تھے جو باقاعدہ فوجی نہیں تھے۔ یہ لوگ انعام و اکرام کے لالچ میں یہاں آئے تھے۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے تھیلے تھے۔ ان تھیلوں میں انہوں نے راستے سے نوکیلے پتھر جمع کر کے بھر رکھے تھے۔

یزیدی لشکر نے آتے ہی قافلہ حسینی کے خیمے دریائے فرات کے قریب سے اٹھوا دیے تھے۔ اس موقع پر جنگ کے آثار رونما ہوئے تھے۔ اصحاب حسینؑ، یزیدی لشکر سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے لیکن امام حسین علیہ السلام نے اپنے جاں بازوں کو منع کر دیا۔ آپ جانتے تھے کہ اگر دریا سے خیمے ہٹانے پر جنگ ہوئی تو یزیدی حکومت یہی پروپیگنڈا کرے گی کہ حسین ابن علیؑ دریا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اسی لیے ہماری فوج نے ان سے جنگ کی اور مجبوراً انہیں قتل کرنا پڑا۔ اس طرح یزیدی حکومت کے شیطانی منصوبہ ساز ایک عظیم مقصد کے لیے دی جانے والی عظیم ترین قربانی کو خاک میں ملانے کی کوشش کرتے۔ صحرا میں حر کے لشکر کو بھی جنگ کر کے ختم کیا جاسکتا تھا لیکن اگر جنگ کا آغاز نواسۂ رسولؐ کی جانب سے ہوتا تو یزیدی حکومت تمام الزامات سے بری ہو جاتی اور اللہ کی راہ میں دی جانے والی قربانی کو ذاتی جھگڑے کا نتیجہ قرار دے دیا جاتا۔

حر ابن یزید ریاحی ایک آزمودہ کار سپاہی ہی نہیں، باشعور انسان بھی تھا۔ وہ جب سے امام حسین علیہ السلام سے ملا تھا اس وقت سے اب تک اس نے امام حسین علیہ السلام کی شخصیت، ان کے روّیے اور مختلف موقعوں پر آپؑ کے اقدامات کا بہت غور سے مشاہدہ کیا تھا۔ اس نے امام علیہ السلام کی جرات و بہادری کا بھی اندازہ لگالیا تھا اور آپؑ کی رحم دلی اور سخاوت کا بھی وہ عینی گواہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگی تو صحرا کی دھوپ اور پیاس کی شدت سے کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ نواسۂ رسولؐ کی رحم دلی تھی کہ انہوں نے جانتے ہوئے بھی کہ یزیدی لشکر ان کے خون کا پیاسا ہے انہیں پانی کے ذخیروں کے ذریعے صحرا میں ایک نئی زندگی عطا کر دی تھی۔ اس کے برعکس یزیدی لشکر نے کربلا میں آتے ہی دریائے فرات پر قبضہ کر لیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کے خیموں میں پانی ختم ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ دریائے فرات کے ٹھنڈے پانی سے چوپائے تک اپنی پیاس بجھا رہے تھے لیکن رسول اسلامؐ کی اولاد پر پانی بند تھا۔ بڑے اور بچے پیاس کی شدت سے بے حال تھے۔ مرد اور عورتیں صبر و

برداشت کی تصویر بنے ہوئے تھے لیکن چھوٹے چھوٹے بچوں کو خاموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بچے سارے دن اور ساری رات روتے بلکتے رہتے اور نڈھال ہوکر ذرا دیر کو خاموش ہوجاتے پھر تھوڑی دیر بعد پیاس کی شدت انہیں دوبارہ تڑپانے لگتی اور وہ بے قرار ہوکر رونے لگتے۔ خاص طور پر رات کے وقت جب سناٹا ہوتا اور دریائے فرات کے کناروں سے پانی بہنے کی آوازیں سنائی دینے لگتیں تو چھوٹے بچوں کی پیاس اور بھڑک اُٹھتی۔

☆☆☆

صحرائے کربلا میں طلوع ہونے والا سورج تیزی سے اوپر آتا جارہا تھا۔ عاشور کا دن روشن ہورہا تھا۔ حر ابن یزید ریاحی کی ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ساری رات حسین ابن علیؑ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے ایک ایک کر کے گزرتے رہے تھے۔ ضمیر کی خلش نے اسے ساری رات سونے نہیں دیا تھا۔ کاش وہ نواسۂ رسولؐ کا راستہ نہ روکتا۔ کاش وہ نواسۂ رسول کو ان کے کہنے کے مطابق سفر کرنے دیتا... کاش...کاش...وہ تاسف کے ساتھ ہاتھ ملتا رہا، اپنے ماتھے کو پیٹتا رہا اور آنسو بہاتا رہا۔

پھر اچانک اسے روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ ''میں اب کچھ نہیں کرسکتا لیکن اتنا تو کر ہی سکتا ہوں کہ حسینؑ ابن علیؑ کی طرف بڑھنے والی تلوار کے راستے میں ڈھال بن جاؤں۔ جب تک سانس باقی رہیں، اس وقت تک میں نیزوں، تیروں اور تلواروں کو ان کی طرف بڑھنے سے روکتا رہوں۔ اپنی جان نواسۂ رسولؐ پر قربان کردوں۔'' اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ یہ وہی روشنی تھی جو گمراہوں کو راستہ دکھاتی ہے اور اپنے گناہوں پر پچھتانے والوں کو اللہ کی مغفرت اور رحمت کے سائے میں پہنچادیتی ہے۔

سورج خاصا اوپر اُٹھ آیا تھا، حر ابن یزید ریاحی فوجی افسر کی مکمل وردی پہنے اور اپنے دستے کے ساتھ میدان میں کھڑا تھا۔ اس کا بھائی اور غلام بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔ حر اپنے بھائی اور غلام کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرچکا تھا۔ قافلہ حسینی کے جانباز اپنے خیموں کے سامنے صف بستہ تھے۔ ان کی تعداد صبح کی نماز سے پہلے سو کے قریب تھی لیکن نماز فجر

کے دوران یزیدی تیر اندازوں نے نمازیوں پر تیروں کی بارش کردی تھی اس حملہ میں امام علیہ السلام کے کئی صحابی تیروں کے لگنے سے شہید ہو چکے تھے۔

امام عالی مقام اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ میدان میں آچکے تھے۔ یزیدی فوج عمر ابن سعد کے اشارے کی منتظر تھی۔ امام علیہ السلام نے اپنے نانا رسول اسلام حضرت محمد مصطفیؐ کا عمامہ پہن رکھا تھا۔ اپنے والد حضرت علی ابن ابی طالب کی تلوار، ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ آپ نے سواری کے لیے ایک گھوڑا طلب فرمایا۔ گھوڑا لایا گیا تو آپ اس پر سوار ہوکر میدانِ کربلا کے درمیان پہنچے۔ پھر آپؑ نے بلند آواز سے یزیدی فوج کو مخاطب کیا۔

''سنو! میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟''

''ہم آپ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ آپؑ، رسولؐ اسلام کے بیٹے ہیں۔'' زرہ بکتر میں ملبوس اپنے اپنے فوجی دستوں کے آگے گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے فوجی سرداروں نے بیک آواز جواب دیا۔

''میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم جانتے ہو کہ میری والدہ گرامی رسول اللہؐ کی بیٹی اور سیدۃ النساء العالمین، حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں؟''

''خدا کی قسم ہم یہ بات جانتے ہیں''۔ میدانِ کربلا میں جہاں جہاں تک امام عالی مقامؑ کی آواز پہنچی، وہاں وہاں سے سننے والوں نے بہ آواز بلند ایک ساتھ جواب دیا۔

امام علیہ السلام نے یزیدی فوج کے دستوں پر اِدھر سے اُدھر نگاہ ڈالی اور کہا۔'' میں تم سب کو خدا کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہوں۔ وہ علیؑ ابن طالبؑ جو مَردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں۔''

''جانتے ہیں.... خدا کی قسم جانتے ہیں....'' یزیدی فوج کے ہجوم سے آوازوں کی گونج سی اٹھی۔

''میں تم سے خدا کی قسم دے کر سوال کرتا ہوں کہ کیا جعفر طیارؑ جو جنت میں پرواز

کرتے ہیں میرے چچا نہیں ہیں؟''

''ہم جانتے ہیں، ہمیں معلوم ہے۔'' ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔

کیا تم جانتے ہو کہ یہ عمامہ جو میں نے پہن رکھا ہے رسول اللہ کا عمامہ ہے اور جو تلوار میرے پاس ہے یہ وہی تلوار ہے جو رسول اللہؐ نے میرے والد کو عطا کی تھی؟''

''ہم اس عمامے کو بھی پہچانتے ہیں اور اس تلوار کو بھی۔'' زرہ بکتر پہنے ہوئے پتھر کے مجسموں نے بیک آواز جواب دیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں ساقی کوثر کا بیٹا ہوں اور قیامت کے دن پیغمبر اسلامؐ کا پرچم میرے والد علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا؟''

''علیؑ ابن ابی طالبؑ کا نام سن کر یزیدی لشکر کے سرداروں، سفاک قاتلوں اور شیطان کے غلاموں کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں تو کئی گھوڑے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوگئے۔ پھر ایک سردار نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے چیخ کر جواب دیا۔'' ہم سب جانتے ہیں لیکن اگر آپ ہمارے امیر یزید ابن معاویہ کی بیعت نہیں کریں گے تو یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ہم آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور آپ کو اسی طرح بھوکا پیاسا قتل کردیں۔'' اس کی آواز میں درندوں کی سی غراہٹ تھی۔

امام عالی مقام کا چہرہ افسردگی سے نڈھال ہوگیا کہ آپ اپنے ناناؐ کی اُمت کو جنت کی طرف بلانا چاہتے تھے اور وہ دوزخ کی آگ میں جانے کو بیتاب تھی! آپؑ جنگ کی ابتداء نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے آپؑ نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اپنے اصحاب کی طرف لوٹ گئے۔

☆☆☆

حر ابن یزید ریاحی، اس کا بیٹا اور غلام دل ہی دل میں خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ امام علیہ السلام کی سچائی اور مظلومیت نے ان کی دنیا بدل کر رکھ دی تھی۔ اب ان میں

برداشت کی طاقت ختم ہوگئی تھی۔ حر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے بیٹے اور بھائی کو اشارہ کیا۔ غلام پہلے ہی تیار تھا۔ ان چاروں نے مل کر ''اللہ اکبر'' کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگادی۔ گھوڑے تیزی سے اچھلے اور آندھی اور طوفان کی طرح فوج یزید پر خاک اڑاتے ہوئے امام عالی مقامؑ کے خیموں کی طرف بڑھنے لگے۔

یزیدی فوجی یہ سمجھے کہ یہ تینوں غصے میں آ کر حسینؑ ابن علیؑ کی طرف حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے ہیں اس لئے کسی نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ رونما ہو رہا ہے۔

تین دن کی بھوک پیاس، قتل ہو جانے اور بیوی بچوں کے لاوارث ہونے اور قیدی بن جانے کے یقین کے باوجود حسینؑ ابن علیؑ کے جانثاروں، رشتہ داروں ساتھیوں حتیٰ کہ ان کے غلاموں تک میں سے بھی کوئی ایک فرد یزیدی لشکر کی طرف نہیں آیا تھا، جہاں پانی کی افراط تھی، غذاؤں کی بہتات تھی اور مال و دولت کے خزانے تھے۔ حسینؑ ابن علیؑ کے گھرانے کے نوکروں اور کنیزوں تک نے یزیدی شان وشوکت کو ٹھکرا دیا تھا۔ نہ ان کا کوئی غلام بھاگا، نہ ان کی کسی کنیز نے دنیاوی مال و دولت کو نظر بھر کے دیکھا اور نہ کسی بچے نے کسی یزیدی فوجی سے پانی کا سوال کیا۔

اس کے برعکس حر ابن یزید ریاحی جو یزیدی لشکر کا بہت اہم سردار تھا، اپنے بھائی اور غلام کے ساتھ دنیا کی ساری کامیابیوں، مال و دولت کے خزانوں اور آب حیات کے دریاؤں کو ٹھکرا کر حسینؑ ابن علیؑ کی غربت، بھوک پیاس، مظلومیت کو سینے سے لگانے ان کی طرف چلا گیا تھا۔

حر ابن یزید ریاحی کا قافلہ حسینی کی طرف جانا، کربلا کے میدان میں یزید کی پہلی شکست تھی لیکن ابھی عمر ابن سعد اور اس کے فوجیوں کو اس شکست کا اندازہ نہیں تھا۔

اصحاب حسینؑ نے مٹی کے بگولے اڑاتے تیز رفتار گھوڑ سواروں کو ادھر آتے دیکھا تو

امام عالی مقامؑ کے اردگرد چٹان بن کر کھڑے ہو گئے۔ امام علیہ السلام کے خشک ہونٹوں پر آج کئی دن کے بعد ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ ''عباس! میرا مہمان، میرا بھائی میرے پاس آ رہا ہے۔ تم خود آگے بڑھ کر جاؤ اور اسے میرے پاس لے کر آؤ'' امام علیہ السلام نے اپنے بھائی ابوالفضل عباسؑ کو حکم دیا۔ امام علیہ السلام علم امامت کے ذریعے جان چکے تھے کہ حر اپنے بیٹے، بھائی اور غلام کے ساتھ کفر کے اندھیرے سے نکل کر حق کی روشنی کی طرف آ رہا ہے۔

آپ کا حکم ملتے ہی حضرت عباسؑ تیزی سے آگے بڑھے۔ ان کے ساتھ حضرت علی اکبرؑ بھی آگے بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے کئی اصحاب بھی حسین علیہ السلام کے مہمان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔ آنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ نواسۂ رسولؐ اور امام وقت حضرت حسینؑ ابن علیؑ کا مہمان تھا ایسا مہمان جسے حسینؑ ابن علیؑ نے اپنا بھائی کہا تھا۔

☆☆☆

امام حسین علیہ السلام کے خیموں سے بہت پہلے حر نے اپنے آپ کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ اس کے بھائی، بیٹے اور غلام نے بھی دوڑتے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور گھوڑوں سے اتر آئے۔ حر نے میدان کربلا کی خاک اپنے سر پر ڈالی اور زار و قطار روتے ہوئے اپنے بیٹے کو حکم دیا ''ادھر آؤ... میرے گھوڑے کی زین سے رسی نکالو....''

حر کے بیٹے نے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی رسی کھینچی اور باپ کے پاس آیا۔

''اب اس رسی سے میرے دونوں ہاتھوں کو اس طرح باندھ دو جس طرح مجرموں کے ہاتھ باندھے جاتے ہیں اور مجھے مجرموں کی طرح کھینچتے ہوئے رسولؐ کے بیٹے کے پاس لے کر چلو۔'' حر نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو حکم دیا۔

''لیکن بابا....'' حر کے بیٹے نے کچھ کہنا چاہا۔

''جلدی کرو.... جلدی کرو.... میں حسینؑ ابن علیؑ کا مجرم ہوں۔ میں ہی تو انہیں گھیر کر یہاں لایا تھا جہاں ان کے خون کے پیاسے آ کر جمع ہوئے ہیں۔ یہی ہاتھ تھے... جن

سے میں نے فاطمہ زہراؑ کے بیٹے کے گھوڑے کی باگ پکڑی تھی۔ جلدی کرو میرے ہاتھ باندھو.... میں نواسۂ رسولؐ کے سامنے مجرموں کی طرح پیش ہونا چاہتا ہوں... وہ سخی باپ کے بیٹے ہیں۔ شاید مجھے معاف کردیں اور میں جہنم کی آگ سے بچ سکوں۔"

حر کے بیٹے نے اس کے ہاتھ رسی سے باندھنا شروع کردیئے تھے مگر حر بے قراری سے بولے جارہا تھا۔ اس کے آنسو اس کی داڑھی میں موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

حضرت ابوالفضل عباسؑ، جناب علی اکبرؑ اور کئی اصحاب حر کے انتظار میں کافی آگے آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ انہوں دیکھا کہ ایک نوجوان نے ادھیڑ عمر کے ایک شخص کے ہاتھوں میں رسی باندھی ہوئی ہے اور اسے مجرموں کی طرح کھینچتا ہوا چلا آرہا ہے اور ان کے پیچھے دو جوان چار گھوڑوں کی باگیں پکڑے سر جھکائے چل رہے ہیں۔

"یہ تمہارے ہاتھ رسی سے کیوں بندھے ہوئے ہیں؟" حضرت عباسؑ نے حر کو پہچانتے ہوئے پوچھا۔

"میں آپ کے آقا کا مجرم ہوں۔ میں بہت بڑا گناہ گار ہوں شہزادے۔" حر نے روتے ہوئے کہا اور حضرت عباسؑ کے قدموں میں گر کر لوٹنے لگا۔ "آپ مجھے معاف کرادیں آقا سے ..آپ میری مدد کریں۔ مجھے معافی دلادیں۔" حر نے التجا کی۔

حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ نے حر کے شانے پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور سینے سے لگالیا۔ "ہمارے آقا سخی ابن سخی ہیں حر! وہ تو تمہارے آنے سے پہلے ہی تمہیں معاف کرچکے ہیں۔" حضرت عباسؑ نے اسے خوش خبری سنائی۔

ہاں حر! بابا نے تمہیں اپنا مہمان اور بھائی کہا ہے۔ انہی کے حکم پر تو چچا عباسؑ تمہارے استقبال کے لیے آئے ہیں۔" حضرت علی اکبرؑ نے اس کے چہرے کی گرد صاف کرتے ہوئے کہا۔

حر کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو اپنی پیشانی پر رکھا۔ "وہ

رحمت اللعالمینؐ کے بیٹے ہیں نا.... مجھ جیسے مجرم کو ان کے علاوہ کون معاف کرسکتا تھا...'' وہ چیخیں مار کر رونے لگا۔'' میں تو ان کے غلاموں کے قدموں کی خاک کے بھی برابر نہیں ہوں پھر بھی انہوں نے مجھے اپنا..... مہمان.... بھائی کہا ..مہمان کہا... بھائی کہا... میں تو ان کا مجرم ہوں میں تو ان کا...'' روتے روتے حر کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

حر کے بھائی، بیٹے اور غلام کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے اور وہ سر جھکائے ہچکیوں سے روتے ہوئے حر کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ حر کا ایک بازو حضرت عباسؑ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرا بازو حضرت علی اکبرؑ نے پکڑ رکھا تھا اور یزیدی لشکر کے ہزار سپاہیوں کا سردار مجرموں کی طرح ہاتھ باندھے امام حسین علیہ السلام کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک گناہ گار انسان کو دوزخ کے راستے پر چلتے چلتے جنت کا راستہ نظر آ گیا تھا!

حسینؑ ابن علیؑ جنگ کیے بغیر ہی جیت چکے تھے اور یزید جنگ سے پہلے ہی ہار چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

قدموں کی خاک

یہ سننا تھا کہ نافع بن ہلالؓ کے خون کی گردش بڑھ گئی۔ ان کا پورا بدن لرزنے لگا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شہزادی زینبؑ کو کس طرح اپنی اور دوسرے اصحاب حسینؑ کی وفاداری کا یقین دلائیں۔

—*****—

میدان کربلا میں ہر طرف خاک اڑ رہی تھی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ آ گیا تھا۔ دھوپ کی شدت کے سبب سر اٹھا کر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ دریائے فرات کے کنارے یزیدی فوج کے پڑاؤ میں جگہ جگہ پانی کا چھڑکاؤ کیا جارہا تھا۔ یزیدی گھڑ سوار بار بار دریا کے کنارے آتے اور اپنے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی کر دیتے تاکہ ان کے جانور جی بھر کر اپنی پیاس بجھا سکیں۔ بہت سے فوجی کپڑے گیلے کر کر کے اپنے سروں لئے پر رکھ رہے تھے تاکہ گرمی کی شدت کو کم کر سکیں۔ فوج کے سقے میدان میں موجود سپاہیوں کے دریا کے کنارے سے مشکیزوں کو بھر بھر کر بار برداری کے جانوروں پر لاد رہے تھے۔

دریا کے کنارے سے دور ریتیلے میدان میں نواسہ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام کے اہل حرم کے خیمے لگے تھے۔ یہاں پانی ختم ہوئے آج تین دن گزر چکے تھے۔ ان خیموں میں رہنے والے کمسن بچے، خواتین اور مرد تین دن سے بھوکے پیاسے تھے۔ ان خیموں کی طرف جانے والے تمام راستوں پر خونخوار فوجی پہرہ دے رہے تھے کہ کہیں کسی ذریعے سے

پانی کا کوئی مشکیزہ، کوئی کٹورا، کوئی قطرہ رسول اللہؐ کے گھر والوں تک نہ پہنچ پائے۔

دریا پر گزشتہ تین دن سے مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ یہ تیس ہزار مسلمان یزیدی فوج کے ملازم تھے۔ ان میں کوئی عیسائی، یہودی یا کافر و مشرک نہیں تھا۔ یہ سب لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے تھے۔ جنت اور دوزخ کے بارے میں انہیں علم تھا۔ یہ حلال و حرام کو جانتے تھے، پاکی و ناپاکی کا شعور رکھتے تھے۔ جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھا کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر کسی نماز میں محمدؐ اور آل محمدؐ پر درود نہ پڑھا جائے تو وہ نماز باطل ہو جائے گی۔

اس کے برعکس ان کا عمل یہ تھا کہ یہ اللہ سے تو یہ درخواست کرتے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود و سلام نازل فرما اور خود گزشتہ تین دن سے محمدؐ کے اہل بیتؑ کو تلواروں، نیزوں، تیروں اور پتھروں سے قتل کر دینے کو بے تاب تھے۔

یہ زبان سے تو محمدؐ و آل محمدؐ پر درود پڑھتے تھے لیکن اپنے ہاتھوں سے اپنی زہر میں بجھی ہوئی تلواروں کو ہوا میں لہرا لہرا کر اعلان کرتے تھے کہ نواسۂ رسولؐ یا تو ہمارے حاکم یزید ابن معاویہ کی بیعت کر لیں ورنہ ہم انہیں قتل کر کے ان کے خیموں کو آگ لگا دیں گے اور ان کے اہل حرم کو قیدی بنا کر یزید کے پاس لے جائیں گے۔

کفر و شرک کے اس نئے دور میں ''مسلمان'' حکمرانوں کو ایسی ہی کم عقل، مسخ شدہ مخلوق درکار تھی۔ برسوں کی حکمرانی، چرب زبان سرکاری مولویوں، درباری خطیبوں اور سرکاری ضرورت کے مطابق احادیث و روایات تخلیق کرنے والے عالموں کے ذریعہ نئے دور کے نئے حکمراں، گمراہی و سفا کی کے چلتے پھرتے نئے بت بنانے اور ان کی پوجا کروانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ کربلا کے میدان میں ایسے بے شمار مسلمان موجود تھے جو نماز کے وقت نماز ادا کرتے، محمدؐ و آل محمدؐ پر درود پڑھتے اور اگلے ہی لمحے آل محمدؐ کا خون بہانے میں بھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

کربلا کے ریتیلے بے آب و گیاہ میدان میں اس مسخ شدہ قوم نے خاندانِ رسالتؐ

کے خیموں کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور اب وہ ان خیموں کو آگ لگانے کو بے تاب نظر آتے تھے۔ برسوں پہلے فاطمہ زہرا کے دروازے پر بھڑکائی جانے والی آگ نصف صدی تک سینہ بہ سینہ شہر بہ شہر سلگتی رہی تھی اور آج میدان کربلا میں اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔

نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلے تو ابراہیمؑ خلیل اللہ کے اللہ تعالیٰ پر یقین کے سبب گل وگلزار میں تبدیل ہوگئے تھے لیکن وارثِ خلیل اللہؑ کو امتِ رسولؐ کے لئے اس یقین کا عملی مظاہرہ بھی کر کے دکھانا تھا اسی لئے نمرود کی آگ کو گل وگلزار بنانے کے لئے نواسۂ رسولؐ باغِ رسالتؐ کے سارے پیڑوں، پودوں، پھولوں، غنچوں اور کلیوں کو اپنے ساتھ لے کر میدان کربلا میں آئے تھے۔ یہاں نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ گل گلزار میں تبدیل ہونے والی نہیں تھی، اس آگ کو اللہ کے رسولؐ کے گھر کو خس وخاشاک میں تبدیل کرنا تھا۔

قبرِ رسولؐ کے مجاوروں کا یہ قافلہ جب سے کربلا میں آیا تھا عورتوں اور بچوں کے دل اسی دن سے دہلے ہوئے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب طرح کی ویرانی اور اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں، رات کے سناٹے میں فرات کے پانی کے کناروں سے چھلک کر بہنے کی آوازیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ خیموں تک آتیں تو نہ معلوم کیوں دل ڈوبنے لگتا۔

رات کے پچھلے پہر جب ابتدائی تاریخوں کا چاند مغرب میں ڈوب جاتا تو کبھی خیموں کے آس پاس، کبھی خیموں سے ذرا فاصلے پر ٹیلوں اور نشیبوں کے درمیان جناب زینبؑ وام کلثومؑ کو ایک سیاہ پوش بی بی کا سایہ سا چلتا پھرتا نظر آتا۔ یہ سیاہ پوش بی بی کبھی خیموں کا طواف کر کے آنسو بہاتیں اور کبھی نشیب کی طرف جا کر وہاں کی زمین کو اپنی سیاہ چادر سے صاف کرنا شروع کر دیتیں اور پھر رات کا اندھیرا اس بی بی کی سسکیوں سے گونجنے لگتا۔

شب عاشور میں کسی وقت امام حسین علیہ السلام خیمے سے دبے پاؤں نکل کر اسی

نشیب کی طرف گئے تھے۔ ان کے جانثار صحابی نافع ابن ہلالؓ نے اپنے آقا کو اکیلا اس طرف جاتے دیکھا تو وہ خاموشی سے امام علیہ السلام کے پیچھے پیچھے چلنے لگے کہ کہیں دشمن رات کے اندھیرے میں نواسۂ رسولؐ پر حملہ نہ کر دے۔ ان کے قدموں کی چاپ سن کر امام علیہ السلام نے انہیں اپنے قریب بلا لیا تھا۔ پھر آپ نے نافع بن ہلالؓ کو اسی نشیب میں اپنی قتل گاہ اور تمام عزیزوں اور دوستوں کے شہید ہونے کی جگہیں دکھلائی تھیں۔

اپنی قتل گاہ سے واپسی پر امام حسین علیہ السلام مختلف خیموں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنی ماں جیسی بہن کے خیمے میں تشریف لے گئے تھے۔ نافع بن ہلالؓ خیمۂ عصمت کے باہر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں حد نظر تک ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے کان ذرا سی آواز بھی سنتے تو ان کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر چلا جاتا اور وہ کسی بھی حملہ آور کو موت کے گھاٹ اتارنے کو تیار ہو جاتے۔ ایسے میں انہیں علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بیٹی زینبؑ بنت علیؑ کی آواز سنائی دی۔ ''بھائی! آپؑ نے اپنے اصحاب و انصار کو آزما لیا ہے؟'' جناب زینبؑ کے لہجے میں بے پناہ تشویش تھی۔

یہ سننا تھا کہ نافع بن ہلالؓ کے خون کی گردش بڑھ گئی۔ ان کا پورا بدن لرزنے لگا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزادی زینبؑ کو کس طرح اپنی اور دوسرے اصحاب حسینؑ کی وفاداری کا یقین دلائیں۔

بی بی زینبؑ کی تشویش بھی بجا تھی۔ اس وقت سارا زمانہ ہی علیؑ کے لعل کا دشمن ہو چکا تھا۔ نواسۂ رسولؐ مدینے سے کوسوں دور اس چٹیل میدان میں اپنے خون کے پیاسوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اس طرف آنے والے تمام راستے کوفے سے آنے والی فوج سے پٹے پڑے تھے۔ جگہ جگہ فوجی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ امام حسین علیہ السلام کے کسی ہمدرد کا زندہ سلامت ان تک پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ ایسے میں اگر نواسہ رسولؐ کے چند ساتھی بھی زندگی اور زندگی کے آرام و آسائش پر ترجیح جاتے تو اس میں حیرت کی کون سی بات تھی!

یہ سوچ کر نافعؓ کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے کہ رسولؐ کا نواسہ، علیؑ کا لعل، فاطمہؑ کا

چاند، امام وقت، ولی عصر، امت رسولؐ کے ہاتھوں آج کتنا بے کس و مظلوم بنادیا گیا ہے۔
آخر نافعؓ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ اصحابِ حسینؑ کے خیمے کی طرف دوڑنے لگے۔

اصحابِ حسینؑ کے خیمے میں دن نکلا ہوا تھا۔ نافع بن ہلالؓ کو اس طرح بے حواس دیکھ کر کئی لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''نافع! خیریت تو ہے۔ تم اتنے بے حواس کیوں نظر آرہے ہو! ارے یہ تم جیسے بہادر کی آنکھوں میں آنسو....''
نافع بن ہلالؓ بے ساختہ رونے لگے... ''قیامت آگئی.... قیامت آگئی۔ بنت زہراؑ اپنے بھائی سے کہہ رہی ہیں ''حسینؑ! تم نے اپنے اصحاب کو اچھی طرح آزمالیا ہے نا.... نکالو تلواریں اور ان کی دھار اپنی گردنوں پر رکھ کر میرے ساتھ چلو.... چلو سب مل کر بنت زہراؑ کو یقین دلادیں کہ سورج مغرب سے نکل سکتا ہے، زمین کی حرکت رک سکتی ہے۔ آسمان زمین پر گر سکتا ہے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوسکتے ہیں، ساری دنیا، دنیا کا ایک ایک انسان اللہ و رسولؐ سے بے وفائی کرسکتا ہے لیکن اصحاب حسینؑ نہیں.... اصحاب حسینؑ نہیں... اصحابِ حسینؑ نہیں....'' نافع بن ہلالؓ زور زور سے رونے لگے۔
خیمے میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ نافعؓ کی باتیں سن کر جانثاروں کے دلوں کی دھڑکنیں بے قابو اور آنکھیں آنسوؤں سے تر بہ تر ہوگئیں تھیں۔ اب مزید کچھ کہنے یا سننے کا وقت ہی نہیں تھا۔ کسی نے اپنی تلوار اٹھائی اور کسی نے اپنا نیزہ، کسی نے اپنا خنجر نیام سے جدا کیا اور کسی نے اپنے تیز دھار والے تیر کی نوک اپنے دل کی دھڑکنوں پر رکھ لی اور وہ سب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بی بی زینبؑ کے خیمے کے دروازے پر جا کر کھڑے ہوگئے۔
انہوں نے اپنی تلواروں کی دھار اپنی گردنوں پر رکھی، نیزوں اور خنجروں کی نوکوں کو اپنے سینے کی طرف دبایا، اس طرح کہ اگر وہ ذرا مزید زور دیتے تو گردنیں کٹ جاتیں، سینے پھٹ جاتے اور ان کے دل ٹکڑوں میں بٹ جاتے۔ پھر اندھیرے میں نافع بن ہلالؓ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ''السلام علیک یا اباعبداللہؑ!''

امام عالی مقامؑ اس وقت اپنی بہن سے آنے والے وقتوں اور شہادت کے بعد کی حکمت عملی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ خیمے کے باہر بہت سے قدموں کی آہٹ اور نافعؓ کے سلام کی آواز سن کر آپ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے خیمے کا پردہ اٹھایا تو مختلف خیموں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں اپنے باوفا اصحابؑ کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''وعلیکم السلام....نافعؓ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں....حبیبؓ، کیا ہوا؟....چچا مسلمؓ بن عوسجہ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ تلوار آپ نے اپنی گردن پر کیوں رکھی ہوئی ہے؟ زہیرؓ! یہ خنجر ہٹاؤ اپنے سینے پر سے۔ عابسؓ!...ابوثمامہؓ! شوذبؓ! ان نیزوں کو اپنے سینوں سے ہٹاؤ..'' امام حسین علیہ السلام ایک ایک بہادر کے پاس جا کر اس کا اسلحے والا ہاتھ تھامنے لگے۔

''یا بن رسول اللہؐ! بنت زہراؑ سے کہہ دیجئے کہ ان کے بھائی کے اصحاب حاضر ہیں اور کل کے دن اپنی وفاداری کا یقین دلانے آئے ہیں۔ ہماری جانیں ہماری نہیں ہیں۔ یہ تو آپؑ کی امانت ہیں۔ آقا! شہزادی حکم دیں تو ہم ابھی اسی وقت اپنی تلواروں سے اپنی گردنیں جدا کر کے آپ کی جوتیوں کا صدقہ ادا کرنے کی کوشش کریں...'' ابوثمامہ صیداویؓ نے تمام اصحاب کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کی۔

اپنے اصحاب کی بے مثال محبت، بے پناہ عقیدت، لازوال وفاداری اور ان کے لہجے کی ان مٹ سچائی کو محسوس کر کے امام علیہ السلام کا سینہ چوڑا ہو گیا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماحول پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ اس گہرے سناٹے کو سسکیوں کی اس آواز نے توڑا جو خیمہ عصمت کے پردے کے پیچھے سے آئی تھی۔

اس آواز کو سن کر اصحاب حسینؑ نے ادب سے سر جھکا دیے۔ پھر ذرا دیر بعد نافعؓ بن ہلال کی آواز بلند ہوئی۔ ''شہزادی! ساری دنیا کے سارے انسان شاید کسی اور مٹی سے بنے ہوں لیکن شہزادی! اصحابِ حسینؑ کا خمیر تو صرف اور صرف حسین علیہ السلام کے قدموں تلے کی خاک سے اٹھا ہے۔ یہ خاک حسینؑ کے قدموں کے نیچے کی خاک ہے اور قیامت تک

حسینؑ کے قدموں میں رہے گی۔''

خیمہ عصمت سے آنے والی سسکیوں کی آواز اچانک تیز ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ دور ہونے لگی۔

امام حسینؑ اپنے جانثاروں کو اپنے سینے، ہاتھوں اور رخساروں سے لگائے کھڑے تھے۔ بہادروں نے اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دیے تھے۔ ان کی سسکیوں کے درمیان نواسہ رسولؐ کی بھرائی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ ''خدا کی قسم! تم جیسے اصحاب تو کسی کو نہیں ملے..... خدا کی قسم تم جیسے اصحاب تو آدمؑ سے لیکر خاتمؑ تک کسی کو نہیں ملے۔ خدا کی قسم! تم جیسے اصحاب نہ رسولؐ اللہ کو ملے نہ علی مرتضیٰؑ کو ملے نہ حسن مجتبیٰؑ کو ملے۔''

☆☆☆☆☆

منزل آگئی

سورج ڈھل رہاتھا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ سارا میدان گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس قدر مٹی اڑ رہی تھی کہ سورج کی دھوپ مدہم ہوگئی تھی۔ دھوپ ہلکی ہونے کے باوجود فضا میں ایسا حبس تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

—*****—

وہ شخص کئی ہفتے سے سفر میں تھا۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کا برا حال تھا۔ راستے میں وہ چند دن گرفتار بھی رہا۔ فوجیوں نے اسے سفر کے دوران پکڑ کر بند کر دیا تھا۔ ان دنوں راستوں میں جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم تھیں۔ شہر میں آنے والوں، شہر سے جانے والوں اور تجارتی قافلوں کی سخت چیکنگ ہوتی تھی۔ چیکنگ کرنے والے فوجی سخت بے رحم لوگ تھے۔ انہیں حکومت کی طرف سے بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ انہیں جس کسی پر ذرا سا شک ہوتا تو یہ اس شخص کو بے دردی سے قتل کر کے اس کی لاش صحرا میں پھینک دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس مسافر کو پکڑنے کے بعد کئی دن قید میں رکھا۔ پھر اس کا سارا قیمتی سامان چھین کر اسے رہا کر دیا۔

مسافر کے کپڑوں میں کچھ رقم چھپی ہوئی تھی۔ اس نے آزاد ہوتے ہی ایک گھوڑا اور راستے کا تھوڑا سا سامان خریدا اور اللہ کے بھروسے پر دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب وہ بڑی احتیاط سے سفر کر رہا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ ادھر ادھر

دیکھتا جارہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ ان دنوں کوئی جنگ ہونے والی ہے اسی لیے حکومت کے فوجی کوفے اور اردگرد کے قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو صحرا سے ہوکر گزرتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صحرا میں بھی جنگ ہوسکتی ہے۔

وہ ادھر ادھر کے خطرناک راستوں سے بچتا بچاتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں دریائے فرات کے کنارے ایک بہت بڑی فوج جنگ میں مصروف نظر آرہی تھی۔ اس نے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ وہ جس راستے سے یہاں آیا تھا اس راستے پر بھی اب اسے گرد وغبار کے مرغولے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔ کوفے کی جانب سے تازہ دم فوج کے دستے اسی طرف آرہے تھے۔

مسافر کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ بس آگے بڑھتا رہے۔ وہ میدان جنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب اس کے کانوں میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ، اونٹوں کے بلبلانے اور انسانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کے پیچھے گرد وغبار کے بادل چھٹنے لگے تھے۔ اب گھڑسواروں کے ہیولے اسے واضح نظر آنے لگے۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ حکومت کے فوجی ہیں اور یہ اسی فوج کا حصہ ہیں جو دریائے فرات کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے آگے بڑھا۔ میدان جنگ کا منظر اب اس کے بالکل سامنے تھا بلکہ اب وہ خود اس منظر کا حصہ بن گیا تھا۔ اس نے دیکھا آگ برساتے سورج کے نیچے ایک شہ سوار اپنے گھوڑے پر جھکا ہوا بیٹھا ہے۔ اس کا لباس لہو سے تربہ تر ہے۔ اس نے سیدھے ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی ہے۔ اس کا تلوار والا ہاتھ نیچے لٹکا ہوا ہے۔ وہ شخص آنکھیں موندے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ماتھے پر لگنے والے زخم سے تازہ تازہ خون بہہ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر سے ہوتا ہوا اس شخص کی سیاہ وسفید نورانی داڑھی میں جذب ہورہا تھا۔

مسافر نے دوسری طرف نظر دوڑائی۔ دوسری طرف سرکاری فوج کے گھڑ سوار، تیر انداز اور پیادے تلواریں، نیزے اور بھالے سنبھالے ہوئے اپنی بکھری ہوئی بے ترتیب صفوں کو منظم کر رہے تھے۔

مسافر اب زخمی شہ سوار کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ سوار کا چہرہ بے حد حسین اور پرکشش لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر جواں مردی اور بے خوفی کا ایسا تاثر تھا کہ اسے دیکھ کر مسافر کو جھر جھری سی آ گئی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہزاروں فوجی اس ایک بہادر انسان سے خوف زدہ نظر آتے تھے۔ ابھی تک انہیں اس زخمی سوار کے قریب آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اسی لیے وہ سب مل کر اس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'' مسافر نے شہ سوار کے قریب پہنچ کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام.... ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔'' مسافر کی آواز سن کر زخمی شہ سوار گھوڑے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھ پر تازہ تازہ خون جما ہوا تھا۔ زخمی شہ سوار نے تلوار والے ہاتھ کو اوپر کیا۔ اور تلوار پکڑے پکڑے اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھ کو صاف کیا۔

''بھائی! تم کون ہو اور یہاں کس طرح آ پہنچے''۔

''آپ تو مجھے سخت پیاسے معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے آپ تھوڑا سا پانی پی لیں....'' مسافر نے اپنی چھاگل کا تسمہ کھول کر لکڑی کے ایک پیالے میں پانی نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں.... نہیں.... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تین دن سے پیاسا ضرور ہوں بھائی! لیکن یہ پانی میں نہیں پی سکتا۔'' زخمی شہ سوار نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں اتنی افسردگی تھی کہ مسافر کا دل پھٹنے لگا۔

''تین دن سے پیاسے ہیں آپ!'' مسافر حیرت سے بولا۔ ''اس حال کو آپ کس طرح پہنچے۔ آپ کے ساتھی کیا ہوئے۔ کیا آپ اکیلے یہاں آئے تھے؟...'' مسافر نے ایک ساتھ بہت سارے سوال کر ڈالے

فرمایا آپؑ نے کہ مدینے میں کیا ہے کام
عرض اس نے کی وہی تو ہے دنیا میں اِک مقام
اس سرزمیں پہ ہے مرا آقا مرا امامؑ
برسوں سے جس کے عشق میں روتا ہوں صبح شام
حیدرؑ کے جان و دل ہیں شہ مشرقینؑ ہیں
صدقے میں اس جگہ کے وہیں تو حسینؑ ہیں
اِک میرا شاہزادہ ہے ہم شکلِ مصطفیٰؐ
شہرہ ہے جس کی شکل و شمائل کا جابجا
ماں کا مرادوں والا پسر ہے وہ مہ لقا
سائے میں شہؑ کے اس کو سلامت رکھے خدا
اس رشکِ گل سے دور خزاں کی بلا رہے
یارب! چمن حسینؑ کا پھولا پھلا رہے

مسافر خاندانِ رسالتؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا اور دشت کربلا میں زخموں سے چور اس شہ سوار کی نظریں میدانِ کربلا کا طواف کر رہی تھیں۔ کہیں اس کے اٹھارہ سال کے کڑیل جوان بیٹے کی لاش زمین پر پڑی تھی اور کہیں اس کے بہادر جانثار بھائی کی لاش نہر علقمہ کے کنارے زخموں سے چور نظر آ رہی تھی۔ ایک جگہ تازہ کھدی ہوئی ننھی سی قبر تھی جس میں آسمانِ رسالت کا ایک ننھا ستارہ خاک میں چھپ گیا تھا۔ اس زخمی شہ سوار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور یہ آنسو چہرے کے زخموں سے رسنے والے تازہ تازہ خون کے ساتھ اس کی گھنی داڑھی میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔

مسافر نے دیکھا کہ یہ ایک مظلوم شخص ہے۔ اس کی دعا میں بڑا اثر ہوگا۔ اس نے اس زخمی شہ سوار سے دعا کی درخواست کی۔

عرض اُس نے کی حضور سے ہے بس یہ التجا
کیجیے اُٹھا کے ہاتھ میرے حق میں یہ دعا
پہنچادے مجھ کو قبر علیؑ پر مرا خدا
مولاؑ نے آسماں کی طرف دیکھ کر کہا

جس کو نہیں زوال وہ دولت نصیب ہو
یارب اسے علیؑ کی زیارت نصیب ہو

مسافر کے چہرے پر شکر گزاری کا تاثر تھا۔ جانے کیوں اس کا دل اس شہ سوار کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہ زخمی شہ سوار کے سامنے جھک گیا۔

تسلیم اس نے کی تو یہ بولے شہ انامؑ
قبر علیؑ پہ جا کے یہ کہنا مرا پیام
آتے ہیں آپ درد و مصیبت میں سب کے کام
یہ بے کس و غریب بھی ہے آپؑ کا غلام

تنہا ہوں دشمنوں میں خبر آ کے لیجیے
ہنگامِ ذبح گود میں سر آ کے لیجیے

زخمی شہ سوار نے مسافر کو قریب بلایا اور اُس سے کہا... ''اللہ تمہیں یہ سفر مبارک کرے۔ اگر تمہیں راستے کے لیے کوئی مدد چاہیے تو میں حاضر ہوں۔ میرا گھوڑا، تلوار، نقد رقم تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو، بلا تکلف بتاؤ اس لیے کہ تمہاری طرح میں بھی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا غلام ہوں۔''

مسافر یہ سخاوت، ہمدردی اور دریا دلی دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ یہ کتنا سخی اور بہادر شخص ہے کہ اس کے عزیز قتل کیے جا چکے.... یہ خود زخموں سے چور دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ مجھ سے مدد مانگنے کی بجائے میری مدد کرنے کو تیار ہے۔ یہ شخص کتنا برگزیدہ ہے کہ اللہ کے دین کو بچانے کے لئے اس نے اپنا پورا گھر قربان کردیا۔

وہ مسافر اہل بیتؑ سے محبت کرنے والا تھا۔ اس نے سوچا کہ اہل بیتؑ تو مظلوموں اور بے کسوں کے کام آتے تھے۔ مجھے بھی چاہیے کہ میں بھی اس مظلوم شخص کے کام آؤں چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ یوں بھی اس شہ سوار کی مدد کرنا دین اسلام کی مدد کرنا ہے کیونکہ یہ شخص دین اسلام ہی کو بچانے کے لئے زخموں سے بے حال ہوا ہے۔

یہ سب باتیں سوچتے سوچتے مسافر نے اپنی تلوار نیام سے نکالی۔ ''جناب! اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اب آپ کے ساتھ ہوں، مجھے اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی اجازت دیجیے''۔ مسافر کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

گھبرا کے بولے شاہؑ کہ ہا ہا! قسم نہ کھا
رستہ ہے یاں سے رات بسے کا نجف کو جا
بچنا مرا محال ہے گر جان دی تو کیا
اے بھائی! تو ہے صاحبِ دختر نہ لے رضا

دامن کو آنسوؤں سے بھگوتی ہے رات دن
بیٹی تری ترے لئے روتی ہے رات دن

''میری بیٹی... مگر یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی۔ یہ صفت تو صرف نبیؐ یا امامؑ کے پاس ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کے حالات جانتا ہو!'' مسافر بے تاب ہو کر بولا۔ ''میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ خدا کے واسطے مجھے اپنا نام بتایئے ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔''

ادھر دشمنوں کی صفیں مرتب ہو چکی تھیں۔ بکھرے ہوئے فوجی دستے صحرائی کتوں کے غول کی طرح دوبارہ ایک جگہ اکھٹے ہو گئے تھے۔ تیر اندازوں نے اپنی کمانوں میں تیر جوڑ لیے تھے۔ زرہ بکتر پہنے گھڑ سوار اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچے اپنی تلواروں کو ہوا میں لہرا رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی کمروں میں تھیلے لٹکا رکھے۔ یہ تھیلے پتھروں سے بھرے ہوئے تھے۔

زخمی شہ سوار کے چہرے پر عجب طرح کا جلال تھا۔ اُس نے مسافر کی بات کا جواب نہیں دیا تو مسافر تڑپ کر رہ گیا اور بولا:

بتلایئے برائے خدا مجھ کو اپنا نام
فرمایا: بے نوا، وطن آوارہ، تشنہ کام
بے کس، عزیز مُردہ، اسیرِ سپاہِ شام
عاجز، بلا رسیدہ، ستم دیدہ، مستہام
رنج و غم و الم مرے حصے میں آئے ہیں
یہ سب خطاب میں نے یہاں آ کے پائے ہیں

مسافر کی آنکھیں آنسو برسانے لگیں۔ اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی رکاب کو تھام لیا اور زخمی شہ سوار کے خون میں ڈوبے ہوئے قدموں پر آنکھیں مل کر اُس نے فریاد کی۔

قدموں پہ لوٹ کر یہ پکارا وہ درد ناک
اظہارِ اسمِ اقدسِ اعلیٰ میں کیا ہے باک
بتلایئے کہ غم سے مرا دل ہے چاک چاک
چپ ہوگئے تڑپنے پہ اس کے امامِ پاکؑ
یہ تو نہ کہہ سکے کہ شہ مشرقینؑ ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا "میں حسینؑ ہوں"

اسی لمحے زمین گھوڑوں کی ٹاپوں سے لرزنے لگی۔ گرد و غبار کے بادل اٹھنے لگے۔ تیر اندازوں نے ایک ساتھ سینکڑوں تیر برسائے اور ٹھیک اسی وقت خیموں کی جانب سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ان آوازوں میں سب سے بلند ایک عورت کی آواز تھی۔ مسافر نے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اماں فاطمہ زہراؑ، بابا علی مرتضیٰؑ، نانا رسول خداؐ، آپ کے بیٹے حسینؑ پر ہزاروں دشمن حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ بابا! وقت مدد ہے جلدی حسینؑ کی مدد کو آیئے۔"

مسافر کا سینہ پھٹنے لگا۔ وہ ساری بات سمجھ چکا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے

کی رکاب تھام کر اپنا چہرہ امام حسین علیہ السلام کے قدموں پر رکھ دیا۔ امام حسینؑ کے جوتے خون سے بھرے ہوئے تھے۔ مسافر کا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ اس نے امامؑ کے قدموں کو آخری بوسہ دیا تو امام علیہ السلام نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

یزیدی فوج کے دستے سر پر آ پہنچے تھے۔ مسافر امام علیہ السلام کے گھوڑے کے سامنے آ گیا۔ وہ بلا کی بہادری اور جرأت کے ساتھ تلوار چلا رہا تھا۔ زندگی اب اس کے سامنے بے قیمت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے جسم پر لگنے والے زخموں سے خون ابل رہا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت دھیرے دھیرے جواب دیتی جا رہی تھی مگر اس کی روح ہمیشہ سے زیادہ خوش، مطمئن اور طاقت ور ہو چکی تھی۔ پہلے اس کی نگاہ کمزور تھی، اب طاقت ور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جن کی قبروں اور چہروں کی زیارت کے لئے مدینہ و نجف جا رہا تھا وہ تمام پاکیزہ ہستیاں، وہ تمام ازلی و ابدی روحیں اسے میدانِ کربلا میں اپنے اردگرد نوحہ کناں نظر آ رہی تھیں۔

نوٹ: اس کہانی کا مرکزی خیال میر ببر علی انیسؔ کے ایک معرکتہ الآراء مرثیے ''جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا'' سے لیا گیا ہے۔ مرثیے کے جو اشعار کہانی میں آپ نے ملاحظہ کیے وہ اسی مرثیے سے منتخب کیے گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

وا محمدًا ...... وا مصیبتا

یہ ایک بے گور و کفن لاش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس لاش کو گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا ہے۔ سارا جسم شکستہ تھا اور قریبی زمین جسم سے مسلسل بہنے والے خون سے لال ہو رہی تھی۔

—*****—

آسمان پر ستاروں کی چادر تنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا آج کی رات آسمان کے ستارے زمین سے بہت قریب آ گئے ہیں۔ حد نگاہ تک پھیلا ہوا صحرا، ریت اور مٹی کے ٹیلوں کے اوپر ستاروں کی غیر معمولی چمک و دمک کی وجہ سے ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے صبح ہونے کے قریب ہے لیکن صحرا میں رہنے والا وہ صحرائی جانتا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ صبح ہونے میں دیر ہے۔

وہ ستاروں کی مدد سے صحرا میں سفر کرتا ہوا اپنے قبیلے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کا تعلق دشت نینوا میں آباد بنی اسد کے قبیلے سے تھا۔ وہ گزشتہ مہینے کسی کام سے حجاز کی طرف گیا تھا۔ اب پندرہ بیس دن کے بعد وہ قافلے سے الگ ہو کر اپنے گھر کی طرف واپس آ رہا تھا۔

اس نے ملک کے حالات خراب ہونے کا بھی سنا تھا اور یہاں سے نکلتے وقت عراق کی سرحدوں پر فوجوں کی غیر معمولی نقل و حرکت بھی دیکھی تھی لیکن اس دوران دشت نینوا

میں جو قیامت آ کر گزر گئی تھی اس کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔
اسے کیا معلوم تھا کہ ان چند دنوں میں اس کے علاقے میں کیا کچھ ہو جائے گا۔ وہ تو گھر قریب آنے کی خوشی میں تیز تیز قدم اٹھاتا، ریت کے ٹیلوں، میدانوں اور نشیبوں کو عبور کرتا ستاروں کی روشنی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جس قافلے کے ساتھ وہ یہاں تک پہنچا تھا وہ اسے دشتِ نینوا میں کربلا کے قریب چھوڑ کر آگے نکل گیا تھا۔
وہ ایک نشیب سے گزر کر سامنے والے بلند ٹیلے کے اوپر پہنچا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ حیران کن تھا۔ یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ صحرا کا دور دراز کا میلوں علاقہ ہر طرف سے نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ٹیلے کے نیچے سے لے کر غاضریہ تک کا علاقہ ستاروں کی تیز روشنیوں سے دمک رہا تھا۔
اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ اس کی ساری زندگی اسی صحرا میں گزری تھی لیکن اس نے ستاروں کو کبھی زمین سے اس قدر قریب نہیں دیکھا تھا۔ ستاروں کی چمک دمک نے اس پورے علاقے پر ہر طرف سے روشنیوں کا ایک سائبان تان رکھا تھا۔ روشنیوں کے اس گول شامیانے کے باہر دور دور تک سرمئی تاریکی کا راج تھا۔
اس نے پہلی بار نشیب اور اس کے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ نشیب کے قریب ایک جگہ پر زمین روشن ہو رہی تھی۔ ایسی روشنی کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے رگڑا اور دوبارہ اس طرف دیکھا۔ یہ بے پناہ نور دراصل ایک انسانی جسم سے نکل رہا تھا۔ یہ ایک بے گور و کفن لاش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس لاش کو گھوڑوں کے سُموں تلے روندا گیا ہے۔ سارا جسم شکستہ تھا اور قریبی زمین جسم سے مسلسل بہنے والے خون سے لال ہو رہی تھی۔ لاش کی گردن کٹی ہوئی تھی اور سر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
وہ لرز کر رہ گیا۔ اس قدر بے رحمی کے ساتھ قتل ہونے والا کون ہے! وہ کیسے دشمن تھے جنہوں نے اسے قتل کرنے کے بعد اس کی لاش پر گھوڑے دوڑائے؟ اس کا دل بیٹھنے لگا۔
اس نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے بے اختیار آنسوؤں کو صاف کر کے ادھر ادھر

دیکھا۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ٹیلے سے اتر کر نشیب میں جائے۔ اس کے گھر کا راستہ اسی طرف سے ہو کر جاتا تھا۔

اچانک ایک ملکوتی خوشبو کی مہک ہوا میں پھیلی۔ اس نے اس خوشبو کو محسوس کیا تو اس کا دل درد و غم سے بھر گیا۔ ان خوشبوؤں میں جانے کیا بات تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔

آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں اس نے غاضریہ کے نخلستان کی طرف دیکھا۔ نہر علقمہ کے کنارے پر بھی زمین سے ایسی ہی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پھر میدان کے مختلف حصے اسے چمکتے دکھائی دیے۔ ہر جگہ ایک لاش پڑی تھی۔ زخموں سے چور اور سر بریدہ لاشیں اور ان میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایک ایک لاش کے پاس جائے اور اسے پیار کرے۔ وہ تیزی سے ٹیلے کے اوپر سے نیچے کی طرف اترنے لگا لیکن اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

نشیب میں پڑی ہوئی لاش کے قریب کوئی بیٹھا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا، وہ ایک صحرائی شیر تھا، ببر شیر اور وہ اپنا سر اپنے اگلے پنجوں پر رکھے بیٹھا تھا اور اس کے منہ اور سینے سے عجیب طرح کی غراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ اس غراہٹ میں درندگی کے بجائے درد کی سی کیفیت تھی۔ وہ درد سے بے حال ہو رہا تھا۔ غراتے غراتے وہ کبھی کھڑا ہو جاتا اور اس نورانی لاش کے گرد بے تابی سے طواف کرنے لگتا اور کبھی زمین پر بیٹھ کر زور زور سے غرانے لگتا لیکن اس کی غراہٹ ایسی تھی جیسے وہ آہیں بھر رہا ہو!

شیر کے خوف سے وہ دوبارہ ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اسی وقت اسے صحرا کے چاروں طرف سے روشنیوں کی لمبی لمبی قطاریں آتی دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی سارا ماحول سسکیوں، کراہوں اور درد بھری آواز سے گونجنے لگا۔ وہ ہزاروں لوگ تھے جو اپنے ہاتھوں میں مشعلیں تھامے صحرا کے کونے کونے سے نکلتے چلے آ رہے تھے۔ سفید لباس، لمبے بال، مختلف قد و قامت کے لوگ ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ روتے پیٹتے ہر

طرف سے اس نشیب کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں ایک نورانی لاش سے روشنیاں نکل کر آسمان کی طرف جارہی تھیں۔

سفید لباس پہنے یہ ہزاروں لاکھوں افراد جب قریب آئے تو ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ سمجھ میں آنے لگے۔ یہ سارے لوگ اپنے سینے اور سروں کو پیٹ رہے تھے۔ صحرا کی خاک اٹھا کر بار بار اپنے سروں پر ڈال رہے تھے اور جگر سوز آوازیں بلند کر رہے تھے۔ ''واہ محمداً وامصیبتا... حسینؑ حسینؑ'' یہ آوازیں عورتوں کی لگ رہی تھیں۔

ان آوازوں کو سن کر اس کا دل پھٹنے لگا۔ ''محمدؐ... حسینؑ...!! اس نے سوچا یہ تو رسولؐ کے نواسے کا ماتم ہورہا ہے لیکن حسینؑ تو مدینے میں رہتے ہیں اور یہ اس صحرا میں رات کے آخری پہر یہ ہزاروں لاکھوں عورتیں کہاں سے آگئیں... اس کا سر چکرانے لگا۔

صحرا کی مختلف سمتوں سے آنے والی عورتیں اب نورانی سائبان سے ڈھکے ہوئے حصے میں آگئی تھیں اور نشیب سے لے کر نہر علقمہ کے کنارے تک بکھری ہوئی لاشوں کے گرد طواف کر رہی تھیں.... وہ بار بار زمین سے مٹی اٹھا کر اپنے بالوں میں ڈالتیں، اور ہائے حسینؑ.... ہائے حسینؑ... ہائے حسینؑ کہہ کر ماتم کرنے لگیں۔ نورانی لاش کے قریب بیٹھا ہوا شیر صحرا میں کسی طرف چلا گیا تھا۔

اب اس سے برداشت نہ ہوسکا وہ دوڑتا ہوا ٹیلے سے نیچے اترا اور ان عورتوں کے قریب پہنچا۔ ''خدا کے واسطے مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ یہ نورانی جسم کس کے ہیں اور تم اس طرح ماتم کیوں کر رہی ہو؟''

''ہم قوم اجنہ کی عورتیں ہیں۔ تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ خاندانِ رسالتؐ پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹ پڑیں؟۔ مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کے جسم کے ٹکڑوں کو خون میں نہلا دیا۔ امت نے اپنے ہی نبیؐ کا گھر اجاڑ دیا۔۔۔ علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹوں کو تین دن کا بھوکا پیاس ذبح کر ڈالا۔ وہ آگ جو مدینے میں لوگ لے کر آئے تھے فاطمہؑ کے گھر کو جلانے کے لیے اُس سے تو اس گھر کا ایک دروازہ ہی جلا تھا لیکن آج اُسی آگ سے انہوں نے کربلا میں

فاطمہ زہراؑ کے سارے گھر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ علیؑ کی بیٹیوں کے سر سے چادریں چھین لیں۔ اُنہیں رسیوں میں اس طرح باندھا گیا جیسے قربانی کے جانور باندھے جاتے ہیں۔" قوم اجنہ کی عورتوں نے بین کرتے ہوئے کہا۔

بین سن کر اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ کیا یزیدی لشکر اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ کیا وہ فوجی تیاریاں رسول اللہؐ کے گھر کو برباد کرنے کے لئے تھیں۔ وہ شخص اپنے سر اور سینے کو پیٹ رہا تھا اور چیخ چیخ کر بین کر رہا تھا۔

"یہ تو بتاؤ کہ یہ شیر اس لاش کے قریب کیوں بیٹھا تھا؟" اس نے روتے روتے سوال کیا۔

"یہ شیر اللہ کا فرشتہ ہے اور شیر کی شکل میں لاشِ حسینؑ مظلوم کی حفاظت کر رہا ہے"۔ قوم اجنہ کی عورتوں نے بتایا۔

"تمہیں شہادت کی خبر کس نے دی؟" اس شخص نے پوچھا۔

"ارے تم کیا جانو دوسری مخلوقات بھی نواسۂ رسول کا ماتم کر رہی ہیں۔ پہاڑوں کے پتھر، صحراؤں کے ذرے، درختوں کے پتے، سمندروں کا پانی، شفق کی لالی، صبحِ صادق کا لہو رنگ آسمان، اللہ کے فرشتے، جنات، آسمانوں کے رہنے والے، سورج چاند ستارے، ہر مخلوق حسینؑ کے غم میں سوگوار ہے۔ ہمارے مرد کربلا کی زیارت کر کے جا چکے ہیں۔ اب ہم عورتیں اپنے آقا کی مظلومیت کا ماتم کرنے آئی ہیں۔ حسینِؑ مظلوم کی بہنوں کو تو ظالموں نے رونے بھی نہیں دیا..." قومِ اجنّہ کی عورتوں نے بین کرتے ہوئے کہا اور شہدا کی لاشوں کے سرہانے بیٹھ کر خاک کربلا کو اپنے بالوں میں ڈالنے لگیں۔

وہ شخص خاکِ کربلا کو مٹھیوں میں بھر بھر کر اپنے سر پر ڈالنے لگا اور روتے روتے زمین پر گر گیا۔

☆☆☆☆☆
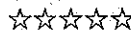
وہ ہم ہی ہیں

وہ خاصا مذہبی آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے امام زین العابدینؑ کے قریب آکر کہا۔ ''اس اللہ کی حمد ہے جس نے امیر المومنین یزید کو فتح عطا فرمائی اور تمہارے بزرگوں کوقتل کیا''۔ اس کے چہرے کی خوشی قابلِ دید تھی۔

*****

خاندان رسالت کی خواتین اور بچے رسیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نواسیوں کے ہاتھ ایک رسی میں بندھے تھے اور ان کی گردنیں دوسری رسی سے باندھی گئی تھیں۔ اس قافلے میں صرف ایک نوجوان تھا جس کی عمر بائیس سال کے قریب تھی۔ یہ حضرت علیؑ ابن الحسینؑ، امام سجاد حضرت امام زین العابدینؑ تھے۔ آپ کے ہاتھوں میں لوہے کی ہتھ کڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں اور گردن میں لوہے کا خاردار طوق پہنایا گیا تھا۔ لوہے کی ہتھ کڑیاں، بیڑیاں اور طوق چلچلاتی دھوپ سے آگ کی طرح تپ رہے تھے۔ امام سجادؑ کی گردن جگہ جگہ سے چھلی ہوئی تھی اور ان خراشوں سے خون رس رہا تھا۔

ان قیدیوں کو ہر طرف سے یزیدی فوجیوں نے گھیر رکھا تھا۔ گلیوں، بازاروں، مکانوں کی چھتوں پر تماشائیوں کا اتنا زیادہ ہجوم تھا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ فتح کے نقاروں کے شور سے کان پھٹے جا رہے تھے اور قیدیوں کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ یزید کے شاہی دربار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ شام کے رہنے والوں کے جتھے کے جتھے ہر طرف سے امنڈے پڑ رہے

تھے۔ بہت سے مرد اور عورتیں فوجیوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح گھس کر خاندانِ رسالتؐ کے ان قیدیوں کے قریب آتے اور انہیں اپنے طنزیہ جملوں اور قہقہوں سے اذیت دینے کی کوشش کرتے۔

ایسے میں ایک بوڑھا شخص حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کے قریب آیا۔ وہ خاصا مذہبی آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے امام زین العابدینؑ کے قریب آ کر کہا۔ ''اس اللہ کی حمد ہے جس نے امیر المومنین یزید کو فتح عطا فرمائی اور تمہارے بزرگوں کو قتل کیا''۔ اس کے چہرے پر خوشی بکھری ہوئی تھی۔

امام زین العابدینؑ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آپؑ نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیا اور فرمایا۔ ''اے شیخ! کیا تم نے قرآن کی یہ آیت پڑھی ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۳) کہہ دو (اے رسولؐ) کہ میں اپنی تبلیغ رسالت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے اہل بیت سے مؤدت رکھو۔''

''ہاں ہاں بہت مرتبہ پڑھی ہے یہ آیت۔'' بوڑھے عربی نے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''اس آیت میں رسولؐ کے جن اہلِ بیتؑ کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ہم ہی ہیں ہماری ہی مؤدت تم پر فرض کی گئی ہے۔'' امام علیہ السلام نے فرمایا۔

بوڑھا عربی غیر یقینی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''اچھا سنو! کیا تم نے یہ آیت پڑھی ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (سورۂ انفال، آیت ۴۱) یاد رکھو جب کسی طرح کی غنیمت تمہارے ہاتھ آئے تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، رسول اور ان کے ذوی القربی یتیم، مسکین اور مسافروں کا حق ہے۔''

''یہ آیت بھی پڑھی ہے میں نے....'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''رسول اللہؐ کے وہ ذوی القربی ہم ہی ہیں جن کا حصہ یعنی خمس نکالنا واجب ہے۔''

امام علیہ السلام نے فرمایا۔

بوڑھے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اور کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت بھی پڑھی ہے کہ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۚ" (سورۂ احزاب، آیت ۳۳) "اللہ چاہتا ہے کہ دور رکھے آپ حضرات اہل بیت سے نجاست کو اور آپ کو پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے"۔ آیت پڑھتے پڑھتے امام علیہ السلام کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

"جی ہاں یہ آیت بھی میں نے پڑھی ہے۔" بوڑھے کی آواز میں ابھی تک غیر یقینی کی کیفیت تھی۔

"وہ اہل بیت نبوتؐ ہم ہی ہیں جن کو اللہ نے نجاست و برائی سے پاک رکھا اور معصوم بنایا۔" امام علیہ السلام نے فرمایا۔

بوڑھے اعرابی نے اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے رگڑا اور حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا جو نور امامت سے منور تھا۔ حضرت علی ابن الحسین علیہ السلام عزم و ہمت کی چٹان بنے ہوئے تھے۔ اس وقت پہلی بار بوڑھے اعرابی کو شور مچاتے شامیوں، پیدل فوجیوں، گھڑ سواروں اور نیزہ برداروں کے چہرے وحشی جانوروں کے سے دکھائی دیے۔ اس سارے ہجوم میں قیدی عورتوں، بچوں اور نورانی چہرے والے اس نوجوان کے سوا اس بوڑھے کو دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آیا۔ اس کے دل پر ایک عجیب طرح کی چوٹ لگی اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈنے لگا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہمیں اپنے جد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم! ہم ان کے قرابت دار، ان کے اہل بیتؑ، ان کی اولاد، ان کی بیٹی کے بیٹے ہیں"۔ امام علیہ السلام نے فرمایا۔

امام علیؑ ابن الحسینؑ کے چہرے کا نور اور لہجے کی سچائی بوڑھے کے دل میں گھر کر گئی۔ اس نے اپنا عمامہ اتار کر زمین پر پھینکا اور اپنے سر اور رخساروں پر تھپڑ مار مار کر رونے لگا۔

پھر اس نے اپنا منہ آسمان کی طرف کیا اور بولا۔ ’’خداوندا! گواہ رہنا کہ میں آل محمدؐ کے دشمنوں سے بیزار ہوں۔ میرا ان سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں۔‘‘

امام علیہ السلام کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ بوڑھے اعرابی نے آپ کے ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ امامؑ نے اس کے ہاتھوں کو سہلایا تو وہ بوڑھا شدتِ غم سے بلکنے لگا۔ ’’آقا! کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔‘‘

’’ہاں ضرور اللہ رحم کرنے والا ہے۔ تم توبہ کرو گے تو تمہاری توبہ قبول ہو گی اور تمہارا شمار ہمارے دوستوں میں کیا جائے گا۔‘‘ امام علیہ السلام نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ بوڑھا اعرابی اس محبت کو محسوس کر کے امامِ وقتؑ کے قدموں میں گرتا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

بت شکن کی بیٹی

سورہ آلِ عمران کی اس آیت نے یزید کے پھیلائے ہوئے اس پروپیگنڈے کے پرخچے اڑا دیئے کہ اس کی کامیابی اور حکومت و اقتدار اللّٰہ کے نزدیک اس کے عزت کی وجہ سے ہے۔

—*****—

اس چھوٹے سے پاک و پاکیزہ گھر میں جب دو بیٹوں کے بعد ایک پیاری سی بچی پیدا ہوئی تو ماں باپ کی خوشی قابلِ دید تھی۔ گھر کی رونق ہی بچیوں سے ہوتی ہے۔ لڑکے بڑے ہوکر گھر سے باہر کی ذمہ داریوں میں مصروف ہوجاتے ہیں لیکن لڑکیاں گھروں میں رہ کر گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ گھر کو سنبھالتی ہیں۔ بھائیوں کے کام کرتی ہیں۔ باپ کی خدمت کرتی ہیں اور ماں کے قدم بہ قدم چل کر زندگی گزارنے کا ہنر سیکھتی ہیں۔

وہ چاند سے چہرے والی بچی اس گھر میں آئی تو ماں باپ بے حد خوش تھے جب بچی کے نانا گھر میں آئے تو اس بچی کو ان کی گود میں دے دیا گیا۔ نانا نے اس کے پھول جیسے چہرے پر نظر ڈالی اور بے اختیار اپنے سینے سے لگالیا۔

ماں باپ دونوں ساتھ ہی کھڑے تھے۔ اچانک انہوں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ بچی کے نانا جانؐ بچی کو عجیب طرح پیار کررہے تھے۔ چھوٹے بچوں کے عام طور پر پیشانی یا سر کے اوپر بوسہ دیا جاتا ہے لیکن نانا جانؐ اپنی نواسی کے ننھے منھے ہاتھوں اور

بازوؤں کو چوم رہے تھے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکی پڑ رہی تھیں۔

آخر نانا جانؐ نے بچی کے لیے دعا کی اور اسے نرمی و آہستگی کے ساتھ اس کی ماں کی گود میں دے دیا اور فرمایا۔ ''یہ بچی تو اپنے باپ کی زینت ہے اس کا نام ''زینب'' رکھو''۔(زین اَب یعنی ''باپ کی زینت'')

''لیکن بابا جانؐ آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' بچی کی ماں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے باباؐ سے پوچھا۔

بابا جانؐ نے اپنی معصوم بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''بیٹی! ابھی جبرائیلؑ آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ اس بچی کا بے حد خیال رکھا جائے۔ ایک وقت آئے گا جب دین اسلام کفر و منافقت کے طوفانوں میں گھر جائے گا۔ اس وقت میرا بیٹا حسینؑ اور میری یہ بچی دونوں ہی طوفانوں کے مقابلے میں چٹان بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ بچی حسینؑ کے شانہ بشانہ جہاد کرے گی لیکن اس کا جہاد تلوار سے نہیں زبان سے ہوگا۔''

☆☆☆

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اس بچی کے ماں باپ اور نانا کون تھے! کیونکہ اس بچی جیسے بزرگ تو دنیا بھر میں اس کے بھائیوں اور بہن کے سوا کسی کو ملے ہی نہیں۔ ماں عالمین کی عورتوں کی سردار، باپ مولائے کائنات، ناناؐ ساری کائنات کے لیے رحمت، دادا محافظ اسلام، مجسمہ ایمان ابوطالبؑ اور بھائی حسن مجتبیٰؑ اور حسینؑ سید الشہدا۔ دونوں جنت کے جوانوں کے سردار، دونوں امامؑ، دونوں رسول اللہؐ کے وجود کا حصہ۔

☆☆☆

جناب زینبؑ کی شادی آپ کے چچا جعفر طیارؑ کے بیٹے عبداللہؓ سے ہو چکی تھی۔ امیر المومنینؑ نے شادی سے پہلے ہی اپنی شرائط سے اپنے داماد کو آگاہ کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے داماد عبداللہؓ سے کہا تھا۔ ''عبداللہ! میری بیٹی زینب اپنے بھائی حسینؑ سے بے انتہا محبت

کرتی ہے۔ حسینؑ سے جدائی اس کے لئے بہت بڑا امتحان ہے اس لئے تم روزانہ رات دن میں کسی وقت اسے حسین کے پاس آنے کی اجازت ضرور دے دیا کرنا۔ یہ حسین کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' جناب عبداللہؓ نے سر جھکا کر اقرار میں گردن ہلائی۔

اور دوسری شرط یہ ہے عبداللہ بیٹے! کہ اگر کسی وقت حسین مدینے سے باہر کسی سفر پر جائے تو تم زینب کو حسین کے ساتھ سفر پر جانے کی اجازت دے دینا۔'' امیر المومنینؑ نے دوسری شرط بیان کی۔ اس وقت وہ چشم تصور سے ۲۸ رجب کو مدینے سے مکہ، مکے سے کوفہ پھر کربلا سے شام اور شام سے مدینے واپسی تک اس سفر کو دیکھ رہے تھے جو سن ساٹھ ہجری سے شروع ہو کر سن اکسٹھ ہجری کے بعد ختم ہونا تھا۔

جناب زینبؑ نے ۲۸ رجب کو امام حسینؑ کے ساتھ مدینے سے سفرِ شہادت کا آغاز کیا۔ شہادت امام حسینؑ تک وہ اپنے بھائی کی محافظ، مشیر، ہم راز بنی رہیں۔ شامِ غریباں آئی تو جناب زینبؑ پیغام حسینؑ کی پیغامبر، یتیم بچوں، بیوہ عورتوں کی محافظ اور شجرِ امامت کی پاسبان بن گئیں۔ اب تک وہ تین اماموںؑ کی مشیر رہ چکی تھیں اب وہ چوتھے امامؑ کے لئے دشمن سے بچانے والی ڈھال بن گئیں تھیں۔

کوفے کا دربار آیا تو منافقین کے چہرے دیکھ کر یہ امامت کی یہ ڈھال، علیؑ کی تلوار بن گئی اور اس طرح میان سے نکلی کہ اس نے کوفے میں ابن زیادہ جیسے سفاک درندے سے لے کر شام کے ظالم و جابر بادشاہ تک کسی کو لہولہان کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ یزید اور ابنِ زیاد جیسے ظالم درندے اپنے انہی زخموں کو چاٹتے چاٹتے مر گئے لیکن علیؑ کی اس تلوار کی کاٹ ایسی تھی کہ کوفہ وشام کے درباروں اور تختوں پر جو ظالم بھی آ کر بیٹھا اسے اس تلوار کی آنچ ہمیشہ محسوس ہوتی رہی۔

☆☆☆

شام کا صوبہ دین اسلام کے مرکز مدینہ منورہ سے بہت دور واقع تھا۔ یہاں خلافت راشدہ ہی کے دور سے ایسے گورنروں کی حکومت رہی تھی جو فتح مکہ کے موقع پر مجبوراً دائرہ

اسلام میں داخل ہونے والوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام لانے سے ان کا اصل مقصد یہی تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لے سکیں اور ان کے جو بزرگ مسلمانوں سے جنگوں کے دوران قتل ہوئے تھے ان کے خون کا انتقام چکا سکیں۔

ان کے منصوبوں کے مطابق نبی اکرمؐ کے لشکر کا سالار، رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کے ہاتھوں شہید ہو چکا تھا۔ ایک منافق عورت شام کے گورنر کے بیٹے یزید سے شادی کے لالچ میں جنت کے سردار، رسولؐ کے نواسے حسنؑ ابن علیؑ کو زہر دے کر شہید کر چکی تھی۔ اب نبیؐ کے دوسرے نواسے کی باری تھی۔ اپنے باپ کے بعد شام کی مسند حکومت پر بیٹھنے والا یزید حسد و انتقام کی اسی آگ میں جل رہا تھا جو آگ اس کے بہت سے بزرگوں اور ہمدردوں کو جلا کر خاکستر کر چکی تھی۔

کربلا میں رسولِ اکرمؐ کے خاندان کے افراد اور ان سے محبت کرنے والوں کو خون میں نہلا کر یزید نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ جو آگ بہت پہلے مدینے میں علیؑ و فاطمہؑ کا گھر جلانے کے لیے لائی گئی تھی اس آگ نے بالآخر کربلا کے میدان میں اپنا کام کر دکھایا تھا۔ کتنا پرانا منصوبہ تھا جو اس کے ہاتھوں انجام کو پہنچا تھا۔ حسینؑ اور ان کے جانثاروں، علیؑ ابن ابی طالبؑ، جعفر طیارؓ اور عقیلؓ ابنِ طالب کی اولاد کو قتل کر کے وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ وہ اپنے خیال میں رسولِ اکرمؐ کے خاندان ہی کو نہیں دین اسلام کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

اب دنیا میں کون باقی بچا تھا جو دین اسلام کی حفاظت کرے۔ اب کون اس کا مقابلہ کر سکتا تھا اب کون اس کے سامنے سر اٹھا کر بات کر سکتا تھا۔ ایک بیس بائیس سال کا قیدی نوجوان، یتیم بچے، بیوہ عورتیں، ذلت و بے پردگی اور اپنے عزیزوں کے غم سے نڈھال علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بیٹیاں۔ اب وہ اسلام کی جیسی چاہے تصویر پیش کرے، قرآنؑ کے جو معنی چاہے بیان کرے، اب کون تھا جو اس کی بات کی تردید کرے یا قرآن کی آیات کو غلط معنی

پہنانے پر اس کی ناپاک زبان کو روکے۔ لیکن یہ سب اس کی غلط فہمیاں تھیں اور اس کی ساری خوش فہمیاں دور ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

اہل حرم کے قیدیوں کا قافلہ ہزار میل سے زیادہ لمبا اور اذیت ناک سفر طے کر کے کوفہ سے شام تک چالیس منزلوں سے گزرتا ہوا جب دربارِ یزید میں پہنچا تو وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ بڑے بڑے علماء، صوبوں کے گورنر، قبیلوں کے سردار، مختلف ملکوں کے سفارتی نمائندے، مختلف مذاہب کے مذہبی رہنما، فوج کے سردار اور افسران مخملین نشستوں والی سنہری کرسیوں پر بڑی بے فکری سے براجمان تھے۔

شام کا صوبہ رومی سلطنت کے قریب تھا۔ امیر شام نے اپنے دربار کو رومیوں جیسی شان وشوکت کے ساتھ سجایا تھا۔ گانے بجانے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ شراب کے جام چل رہے تھے اور شیطان کا نمائندہ بڑے کروفر کے ساتھ ایک اونچے تخت پر رکھی ہوئی سنہری کرسی پر غرور وتکبر کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں ننگی تلواریں اٹھائے حبشی غلام مستعد کھڑے تھے۔ ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور رسیوں میں بندھے ہوئے قیدی اس کے سامنے کھڑے تھے جن کے سامنے ان کے عزیز کربلا میں شہید کر دیئے گئے تھے۔

غرور وتکبر کے اس شیطانی مجسمے نے ایک اچٹتی سی نظر ان قیدیوں پر ڈالی اور شراب کا جام ہونٹوں سے الگ کر کے سورہ آلِ عمران کی چھبیسویں آیت کی بے حرمتی کرنا شروع کی۔

"اے اللہ تمام عالم کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جسے چاہے عزت دے اور تو ہی جسے چاہے ذلت دے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

یہ آیت پڑھتے ہوئے اس نے ایک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ درباری علماء کی طرف دیکھا جیسے ان سے اپنی قرآن فہمی کی داد چاہ رہا ہو۔ جیسے ان سے کہہ رہا ہو کہ دیکھا تم نے

مجھے بھی قرآن پڑھنا آتا ہے اور میں نے اس وقت کیسی مناسبِ حال آیت پڑھی ہے۔

علماء کے چہرے سیاہ پڑ چکے تھے لیکن ان کے سر ہل رہے تھے اور ان کی تسبیحیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ کس میں ہمت تھی کہ بادشاہِ وقت کی بات کو رد کرتا۔ ان کی بداعمالیوں نے ان کے کانوں کو بہرہ اور زبانوں کو گونگا کر رکھا تھا۔

دربار کا سناٹا دیکھ کر یزید کی ہمت بڑھی اور اس نے قیدیوں کی طرف دیکھ کر سب سے سربلند خاتون کو مخاطب کیا۔ ''تمہارے بھائی حسینؑ نے اس آیت کو نہیں پڑھا ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ حق میرے ساتھ ہے اسی لئے تو اللہ نے سلطنت وحکومت تمہارے باپ سے چھین کر میرے باپ کو عطا کردی تھی۔ اسی بات سے اللہ کے نزدیک میری اور میرے باپ کی عزت اور حسینؑ اور اس کے باپ کی..... واضح ہوگئی ہے۔''

یزید جو اسی دربار میں بار بار اپنے اشعار پڑھتا رہا تھا کہ نہ کوئی وحی آئی، نہ فرشتہ، یہ سب بنی ہاشم (خاندانِ رسالتؐ) کا ڈھونگ تھا حکومت حاصل کرنے کے لئے۔ یہ اشعار اس کے دل کی آواز تھے۔ جو شخص کھلے عام اللہ کے فرشتوں اور اللہ کی جانب سے آنے والی وحی کا انکار کرے، وہ قرآن کی آیات کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

دربار مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے مفتی، محدث، عالم، خطیب، قرآن پر ایمان رکھنے والے، رسول اللہؐ کی زبان سے براہ راست قرآن کی تفسیر سننے والے اس وقت دربار میں موجود تھے لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر یزید کی زبان کو روکتا۔

ایسے میں قرآن کے گھر میں پیدا ہونے والی رسولؐ کی نواسی، فاطمہؑ کی بیٹی، پیغامِ حسینؑ کی پیامبر، شہیدوں کے خون کی وارث، زینبؑ بنتِ علیؑ قرآن کا مذاق اڑانے والے ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے چٹان بن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آواز گونجی تو بولتے ہوئے ہونٹ ساکت اور بجتے ہوئے باجے خاموش ہوگئے۔ شراب کے جاموں کی کھنک دم توڑ گئی، چلتی ہوئی ہوا رک گئی، سرسراتے پردے بے حرکت اور منافقت کے ساتھ چلتی ہوئی تسبیحیں ٹھہر گئیں، مسکراتے ہوئے چہرے لٹک گئے اور خوشیوں بھرا دربار بے روح بتوں

کے بت خانے کا منظر پیش کرنے لگا۔

ایسے میں بت شکن کی بیٹی، عالمہ غیر معلّمہ نے اس بت خانے کے سب سے بڑے بت کو انتہائی حقارت کے ساتھ دیکھتے ہوئے پہلے اللہ رب العالمین کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر رسول اللہؐ اور ان کے اہل بیتؑ پر درود وسلام پڑھا۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ روم کی دسویں آیت کی تلاوت فرمائی۔

"آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔"

قرآن مجید کی یہ آیت پڑھنے کے بعد آپؑ نے تکبر وگمراہی کے اس شیطانی کے مجسمے کا للکارا۔

"یزید! زمین وآسمان کے تمام راستے ہم پر بند کر کے اور خاندانِ نبوت کو عام قیدیوں کی طرح دربدر پھرا کر... کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارا جو مقام تھا اس میں کوئی کمی آ گئی اور تو بڑا عزت دار بن گیا؟"

بادشاہ وقت کے دربار میں علیؑ کی بیٹی کی آواز گونجی تو لوگوں کے دل لرز کر رہ گئے۔ حضرت زینبؑ بنتِ علیؑ زخمی شیرنی کی طرح گرج رہی تھیں اور شیطان اور اس کے درباری بے حس وحرکت مجسموں کی طرح بیٹھے تھے۔

سورہ آلِ عمران کی اس آیت نے یزید کے پھیلائے ہوئے اس پروپیگنڈے کے پرخچے اڑا دیئے کہ اس کی کامیابی اور حکومت واقتدار اللہ کے نزدیک اس کے عزت کی وجہ سے ہے۔ سارے دربار پر سکوت طاری تھا۔ اس وقت جناب زینبؑ نے اہل بیتؑ کی اس روحانی طاقت سے کام لیا تھا جس کو محسوس کر کے مباہلے کے لیے آنے والے عیسائی عالموں نے کہا تھا کہ ہم ایسے چہرے دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ دعا کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ

دیں تو یقیناً پہاڑ حرکت کرنے لگیں گے۔

یزید کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ ایک قیدی عورت جس کے سارے عزیز اس کے سامنے ذبح کر دیے گئے تھے اور جو ہزار میل سے زیادہ اذیت ناک سفر طے کر کے رسیوں میں جکڑ کر قیدی کے طور پر اس کے سامنے پیش کی گئی تھی، وہ بادشاہ وقت، اپنے دور کے سب سے بڑے ظالم و جابر حکمران پر ایک ایسا وار کرے گی جس کی اذیت بادشاہ اور اس کے درباری ہی نہیں ان کی نسل کا آخری آدمی تک اپنے مکروہ چہرے پر ہمیشہ ہمیشہ محسوس کرتا رہے گا!

☆☆☆☆☆

زندان کی روشنی

زمانے کے عظیم انقلاب، مصیبتوں کے لمبے دن، بازاروں میں بے پردگی کے دکھ اور درباروں میں قیدیوں کی طرح کھڑے رہنے کی ذلتیں ان کے عزم و استقلال کو شکست نہیں دے سکی تھیں۔

—*****—

اس عمارت میں رہتے ہوئے انہیں کئی مہینے گزر چکے تھے۔ یہ عمارت کیا تھی ایک کھنڈر تھا۔ جھاڑ جھنکار سے بھری ہوئی اونچی نیچی زمین، آسمان کو چھوتی دیواریں۔ چھت کی جگہ کھلا نیلگوں آسمان۔ دن بھر آگ برساتی دھوپ، گرد کے بگولے، شام کو شدید حبس اور رات کے آخری پہر شبنم کے آنسو۔

باہر نکلنے کا دروازہ البتہ سلامت تھا لیکن یہ بھاری بھرکم دروازہ چوبیس گھنٹے بند رہتا تھا۔ دن نکلنے کے بعد اور رات کے اندھیرا پھیلنے سے پہلے یہ دروازہ تھوڑی دیر کو کھلتا۔ چند خونخوار شکلوں کے مسلح پہرے دار اندر آتے اور قیدیوں کے لیے اتنا کھانا پانی دے جاتے کہ یہ قیدی بھوک پیاس سے مرنے نہ پائیں۔ یہ الگ بات کہ اگر ان قیدیوں کے لیے زیادہ کھانا بھی آتا تب بھی شاید بچ کر جاتا کیونکہ ان قیدیوں کو اپنے غموں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ انہیں کھل کر بھوک لگتی۔ وہ کھانا مجبوراً ہی کھاتے اور پانی کے چند گھونٹ بہ مشکل ان کے حلق سے اترتے۔ جن حالات سے یہ سب قیدی گزرے تھے، جو کچھ ان پر بیتی تھی، بھوک، پیاس، مجبوری اور قتل و غارت گری کے جو منظر انہوں نے دیکھے تھے وہ

انہیں زندگی بھر رلانے کو کافی تھے۔

یہ قیدی تھے کون! بیوہ عورتیں، یتیم بچے اور ایک بائیس برس کا نوجوان۔ ان عورتوں میں صرف بیوہ عورتیں ہی نہیں تھیں ان میں سے زیادہ تر عورتوں کے بچے بھی ان کی آنکھوں کے سامنے سفاکی و بربریت کے ساتھ شہید کردیے گئے تھے۔ بہت سی عورتوں کے شوہر ہی نہیں ان کے بھائی، بھتیجے اور سسرالی رشتے داروں کو بھی بے دردی سے قتل کیا جاچکا تھا۔ بچوں کے سروں سے باپ کا سایہ ہی نہیں اٹھا تھا ان کے بڑے بھائیوں اور چچاؤں کو بھی یزیدی فوج کے درندے ذبح کر چکے تھے۔

ان قیدیوں میں زیادہ تر خواتین اور بچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سگے چچا، محافظ نبوت حضرت ابوطالبؑ کی اولاد تھے۔

☆☆☆

اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب عرب کے کافروں اور مذہب کو مسخ کرنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے ان کی بت پرستی اور گمراہی کے مقابلے میں اللہ کی وحدانیت کا پیغام سنایا تو مٹی کے بتوں اور سودی لین دین کے ذریعے سیدھے سادھے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان پر حکمرانی کرنے والے کافروں اور مشرکوں کو اپنا اقتدار اور طاقت خطرے میں نظر آنے لگی۔ اللہ کے رسولؐ کا وجود انہیں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ پہلے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ جب ان کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے اللہ کے رسول کو خریدنا چاہا۔

نبی کریمؐ کے چچا جناب ابوطالبؑ ان کے سرپرست تھے۔ کافروں مشرکوں کے سردار جناب ابوطالبؑ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو نیا دین پھیلانے سے روکیے۔ ہم محمدؐ کی خاموشی کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں۔ مال و دولت کے ڈھیر، زمینیں، باغات، سواری کے اونٹ، گھوڑے، حسین ترین عورتیں۔ ہم سب کچھ دینے کو تیار ہیں۔

جناب ابوطالبؑ ان کی بات سن کر مسکرائے۔ آپ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کو

جانتے تھے۔ وہ چاہتے تو خود ہی اس پیشکش کو ٹھکرا دیتے لیکن انہیں معلوم تھا کہ محمدؐ اگرچہ ان کے بیٹے کی طرح ہیں لیکن اللہ کے اولوالعزم پیغمبرؐ ہیں اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کی طرف سے کوئی بات اپنی مرضی سے کہہ دے۔ اسی لیے آپ نے کافروں کی شرائط نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جواب دیا وہ جناب ابوطالبؑ کی توقع کے عین مطابق تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "چچا جان کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں تب بھی میں دین اسلام کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا۔"

جناب ابوطالبؑ کا سینہ فخر سے تن گیا۔ آپ نے اپنے بھتیجے کو سینے سے لگایا اور ان کے دونوں شانے تھام کر مکمل یقین اور سچائی سے کہا۔ "بیٹا اللہ رب العالمین نے اپنے دین کی تبلیغ کا جو کام تمہارے سپرد کیا ہے تم اسے بلاخوف وخطر جاری رکھو۔ اسلام کے دشمنوں سے میں نمٹ لوں گا۔"

جناب ابوطالبؑ کے والد نے دنیا سے جاتے وقت اپنے بیٹے جناب عبداللہؑ کے یتیم فرزند اور اپنے پوتے حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں انہیں وصیت کی تھی کہ ابوطالب! یہ تمہارے سگے بھائی کا بیٹا ہے۔ یہ کوئی عام بچہ نہیں۔ تم ساری زندگی اپنے ہاتھ، زبان اور جان و مال کے ذریعے اس کی مدد کرنا، اس کی انتہائی حفاظت کرنا، اسے دشمنوں سے محفوظ رکھنا۔"

حضرت ابوطالبؑ نے ساری زندگی اپنے بچوں سے زیادہ اللہ کے رسولؐ کی حفاظت کی۔ شعب ابی طالبؑ کے اذیت ناک دنوں میں رات کے وقت آپؑ نے کبھی اپنے بھتیجے کو ایک جگہ نہیں سلایا۔ جس طرف سے خطرہ ہوتا وہاں جناب ابوطالبؑ کبھی اپنے بیٹے علیؑ کو سلاتے اور کبھی عقیلؓ اور جعفرؓ کو تاکہ اگر دشمن رات کی تاریکی میں حملہ کرے تو چاہے ان کے سگے بیٹے قتل ہو جائیں مگر اللہ کے رسولؐ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

شعب ابی طالبؑ سے نکلنے کے آٹھ مہینے بعد چھیاسی سال کی عمر میں محافظ اسلام

حضرت ابوطالبؑ کا وقت آخر آ پہنچا۔ جس طرح ان کے والد جناب عبدالمطلبؑ نے دنیا سے جاتے وقت نبی کریمؐ کے بارے میں انہیں وصیت کی تھی اسی طرح دنیا سے جانے سے پہلے انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلا کر وصیت کی اور ان سے کہا۔ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ تمہارے چچا زاد بھائی بھی ہیں اور ساری کائنات کے لیے اللہ کے آخری رسولؐ بھی۔ ان کے بعد کوئی رسولؐ نہیں آئے گا۔ اپنی آخری سانس اور خون کے آخری قطرے تک اللہ کے رسولؐ اور اللہ کے دین کی حفاظت کرنا۔''

ان تینوں بھائیوں نے اپنے والد سے جو وعدہ کیا اسے ساری زندگی نبھایا۔ حضرت علی علیہ السلام کی ساری زندگی رسولؐ کی زندگی میں کافروں اور مشرکوں سے جنگ کرتے، زخم کھاتے گزری اور رسول اللہؐ کے دنیا سے جانے کے بعد کی باقی ماندہ زندگی صبر و برداشت کا امتحان دیتے اور دین اسلام کی تعلیمات کو منافقین کی سازشوں سے بچاتے ہوئے گزری اور اسی سبب سے آپؑ منافقین کے ہاتھوں مسجد کوفہ میں شہید کر دیے گئے۔

جناب جعفر طیارؓ نے اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے جنگ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔ جناب عقیلؓ قول و عمل کے ذریعے سے رسولِ اسلامؐ اور ان کے دین کی حفاظت کرتے کرتے دنیا سے تشریف لے گئے۔

دین اسلام کی خون کے آخری قطرے اور آخری سانس تک خدمت و حفاظت کرنے کے لیے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو جو وصیتیں کیں وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ جناب جعفر طیارؓ اور جناب عقیلؓ کی وصیتیں تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتیں لیکن کربلا کے میدان میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے جنگ کر کے شہید ہونے والوں کے نام اس بات کی گواہی کے لیے کافی ہیں کہ جناب جعفر طیارؓ اور جناب عقیلؓ نے اپنی اپنی اولادوں کو وہی وصیت کی تھی جو ان کے بزرگوں کا طرہ امتیاز تھا۔ عاشور کے دن کی قربانیاں دین اسلام کو بچانے کے لیے دی جا رہی تھیں۔

عاشور کے دن رسول اکرمؐ کی جگہ ان کا نواسہ حسینؑ دین اسلام کا محافظ تھا۔ جس طرح

رسولؐ اللہ کے زمانے میں محافظ اسلام جناب ابوطالبؑ اور ان کے بیٹے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کر رہے تھے اسی طرح عاشور کے دن جناب ابوطالبؑ کی تیسری نسل، ان کے پوتے اور نواسے دین اسلام کو مسخ ہونے سے بچانے کے لیے اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر رہے تھے۔ کربلا میں شہید ہونے والے بنی ہاشم کے اٹھارہ شہید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور محافظ اسلام جناب ابوطالبؑ کے پوتے تھے۔

☆☆☆

جناب ابوطالبؑ کا سارا خاندان نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں کربلا میں شہید ہو چکا تھا۔ ان کے خاندان کے مرد ایک عظیم امتحان سے گزر چکے تھے۔ اب زندان شام کی اذیتوں میں جناب ابوطالبؑ اور رسول اکرمؐ کی نواسیاں صبر و برداشت کے عظیم امتحان سے گزر رہی تھیں۔ قدرت نے جناب ابوطالبؑ کے خاندان کے چند افراد کو زندہ رکھا تھا۔ اللہ کی راہ میں شہید ہو جانے والوں کی نسل کو انھی افراد کے ذریعے باقی رہنا تھا اور آنے والے وقتوں میں اس پاکیزہ نسل کو سارے کرہ ارض پر پھیل جانا تھا تا کہ جب سلسلہ امامت کا آخری تاجدار دنیا میں آکر اپنے جدِ مظلوم کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کے خونِ ناحق کا انتقام لے تو حسینِ مظلومؑ کی ساری دنیا میں پھیلی ہوئی یہ نسل اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں کا عبرت ناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

رسول اسلام حضرت محمد مصطفیؐ اور محافظ اسلام جناب ابوطالبؑ کی یتیم اور بے سہارا اولاد نام نہاد اسلامی حکومت کے قید خانے میں دکھوں اور اذیتوں کے عظیم امتحان سے کامیاب و کامران گزری تھی۔ زمانے کے عظیم انقلاب، مصیبتوں کے لمبے دن، بازاروں میں بے پردگی کے دکھ اور درباروں میں قیدیوں کی طرح کھڑے رہنے کی ذلتیں ان کے عزم و استقلال کو شکست نہیں دے سکی تھیں۔ اب ہر بچہ اپنے آقا و مولاؑ کے نقش قدم کو چومتا ہوا نظر آتا اور ہر عورت کے اندر حضرت زینبؑ بنتِ علیؑ کی ناقابل شکست روح سما چکی تھی۔

دشمنان اسلام کے سامنے یہ صبر و برداشت کا پہاڑ بنے ہوئے تھے لیکن قید خانے کی تنہائی میں اپنے ایک ایک عزیز کو یاد کر کے آنسو بہاتے۔ آخر یہ سب عورتیں اور بچے انسان تھے اور یہ جن پے در پے صدموں سے گزرے تھے، وہ تو پتھروں کو ریزہ ریزہ کر سکتے تھے۔

ان خواتین میں سے دو خواتین کی حالت سب سے گئی گزری تھی۔ جناب ام لیلیٰؑ جو سید الشہداء کی شریک حیات اور ہم شکل پیغمبر حضرت علی اکبرؑ کی والدہ تھیں۔

جناب ام ربابؑ امام حسین علیہ السلام کے دو چھوٹے بچوں کی ماں تھیں۔ ان کا چھ ماہ کا علی اصغرؑ اپنی بے زبانی سے یزیدی لشکر کو ہمیشہ کے لیے شکست دے کر میدان کربلا کی خاک پر سو رہا تھا۔ جناب ام ربابؑ نے عاشور کے دن جب اپنے اس ننھے سے بھوکے پیاسے بچے کو امام حسین علیہ السلام کی گود میں دیا تھا تو اس کے بعد اسے کبھی نہ دیکھ سکیں۔

بس اس بچے کا گلے سے کٹا ہوا پھول جیسا سر وہ کربلا سے کوفے، اور کوفے سے شام تک کے سفر میں بار بار یزیدی فوجیوں کے نیزوں پر چڑھتا اور صندوقوں میں بند ہوتا دیکھتی رہی تھیں۔ علی اصغرؑ کا پھول سا چہرہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اپنے مظلوم آقا اور شریک حیات حضرت امام حسین علیہ السلام کی دوسری نشانی جناب سکینہؑ ان کے ساتھ نہ ہوتی تو شاید وہ اپنے معصوم بچے کے غم میں روتے روتے دنیا سے چلی جاتیں۔

بی بی سکینہؑ کا سبھی خیال رکھتے تھے۔ وہ سبھی کی لاڈلی تھیں۔ کبھی ان کی پھوپھی جناب زینبؑ انہیں گود میں بٹھا لیتیں، کبھی چھوٹی پھوپھی جناب ام کلثومؑ انہیں پیار کرنے لگتیں لیکن جناب سکینہؑ کو کسی پل چین نہ آتا۔ انہیں تو بچپن سے اپنے پیارے بابا کے سینے پر سونے کی عادت تھی۔ ان کے بابا انہیں سلانے سے پہلے ان سے پیار بھری باتیں کرتے، ان کے بالوں کو سہلاتے، ان کے ماتھے کو چومتے اور جب وہ گہری نیند سو جاتیں تو امام علیہ السلام انہیں بستر پر لٹا کر تھوڑی دیر تھپکتے رہتے اور پھر نماز شب کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

عاشور کی شام سے اب تک جانے کتنے مہینے گزر چکے تھے کہ جناب سکینہؑ گہری نیند نہیں سو سکی تھیں۔ وہ بابا کو یاد کر کے روتے روتے بے دم ہو جاتیں تو تھوڑی دیر کو سو جاتیں مگر ذرا ہی دیر بعد گھبرا کر اٹھ جاتیں اور بلک بلک کر رونے لگتیں۔

گزشتہ کئی دنوں سے ان کی حالت روز بہ روز بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے بڑے بھائی حضرت علیؑ ابن الحسینؑ کے پاس جا کر کہتیں۔ ”بھائی! مجھے باباؑ کی شکل دکھا دو۔ بھائی.... مجھے معلوم ہے باباؑ شہید ہو چکے ہیں ان کا جسم کربلا کی ریت میں دفن ہو چکا ہے۔ لیکن بھائی! بابا کا سر یزید کے پاس موجود ہے۔“

امام علی ابن الحسین علیہ السلام اپنی چھوٹی سی بہن کی باتیں سنتے تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں آپ سر جھکا کر رونے لگتے۔ یزید جیسے سفاک انسان سے آپ کوئی فرمائش نہیں کرنا چاہتے تھے پھر آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر وہ یزید سے کہہ کر اپنے بابا کا سر اس قید خانے میں منگا بھی لیں تو سکینہ اسے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکے گی۔

آج بی بی سکینہؑ کی حالت دیکھ کر سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کبھی بی بی ام ربابؑ انہیں سینے سے لگاتیں، کبھی جناب زینبؑ انہیں گود میں لٹاتیں، کبھی جناب عباسؑ کی زوجہ ان کے پاس آ کر ان کے بالوں کو سہلانے لگتیں، جس طرح حضرت عباسؑ اپنی اس بھتیجی کو چاہتے تھے اسی طرح جناب عباسؑ کی زوجہ بھی انہیں اپنی اولاد سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ جناب سکینہؑ بھی اپنی چچی سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ چچا عباسؑ کے بعد تو یہ محبت اور بڑھ گئی تھی لیکن آج جناب سکینہؑ کا دل ہی ان کے قابو میں نہیں تھا۔ آج وہ کسی کے بہلانے سے چپ نہیں ہو رہی تھیں۔

روتے روتے رات کے آخری پہر انہیں غنودگی سی آ گئی۔ سب لوگ سمجھے کہ اب سکینہؑ صبح تک سوتی رہیں گی لیکن ذرا دیر بعد سکینہؑ اچانک ہی گھبرا کر اٹھ گئیں اور قید خانے کی تاریکی میں ان کے مسلسل رونے سے کہرام برپا ہو گیا۔

”بابا.... بابا جان!.... میرے بابا جان کہاں گئے؟“ جناب سکینہؑ اندھیرے میں کبھی

ایک طرف دیکھتیں کبھی دوسری طرف دیکھ کر چیخیں مارنے لگتیں۔

''سکینہ.... سکینہ بیٹی!'' جناب زینبؑ نے انہیں خود سے لپٹا لیا۔

''پھوپھی اماں ... میرے بابا ابھی تو آئے تھے میرے پاس.... بابا یہیں بیٹھے تھے.... بابا... بابا۔'' جناب سکینہؑ بے قرار ہو کر اپنے بابا کو پکارنے لگیں۔

حضرت علیؑ ابن الحسینؑ ان کے قریب آئے تو جناب سکینہؑ اور زور سے رونے لگیں۔

''بھائی! مجھے بابا کا سر منگا دیں۔ مجھے بابا کی زیارت کرادیں بھائی.... مجھے ان کی خوشبو سنگھادیں۔'' بی بی سکینہؑ کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ جناب علیؑ ابن الحسینؑ کا دل کٹنے لگا۔ آپؑ خاموشی سے اٹھ کر قید خانے کے دروازے پر گئے۔ پہرے داروں سے کچھ کہا اور وہیں ایک دیوار کے سہارے تاریکی میں کھڑے ہو کر زار و قطار رونے لگے۔

ذرا دیر بعد قید خانے کا بھاری دروازہ کھلا۔ ایک پہرے دار اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی اور تھالی میں مظلومِ کربلا کا خون میں ڈوبا ہوا سر رکھا ہوا تھا۔ مشرق سے طلوع ہوتا ہوا چاند اب قید خانے کی اونچی دیوار کے اوپر آ گیا تھا۔ قید خانے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ جناب سکینہؑ نے چاند کی روشنی میں عاشور کے دن ڈوبنے والے امامت کے سورج کو دیکھا تو بے تاب ہو کر اس کی طرف دوڑیں اور اپنے بابا کے سر کو تھالی سے اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ آپ کبھی بابا کے خون آلود سر کو چومتیں، کبھی اسے اپنی بانہوں میں لے لیتیں اور چیخیں مار مار کر رونے لگتیں۔ ان کے ساتھ تمام قیدی عورتیں اور بچے بلک بلک کر روئے جا رہے تھے۔ جناب سکینہؑ زمین پر اپنے بابا کے سر کو لیے بیٹھی تھیں اور ان کے چاہنے والے ان کے گرد حلقہ بنائے آنسو بہا رہے تھے۔

روتے روتے اچانک ہی سب کو احساس ہوا کہ سکینہؑ کی آواز آنا بند ہوگئی ہے۔ جناب زینبؑ نے دیکھا کہ ان کی بھتیجی اپنے بابا کے سر کو سینے سے لگائے لگائے زمین پر لیٹ کر سو گئی ہے۔ جناب زینبؑ نے بھتیجی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر انہیں اٹھانا چاہا تو آپ کی چیخیں نکل گئیں۔ جناب سکینہؑ میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی۔ جناب

زینبؑ کو محسوس ہوا جیسے سکینہؑ اپنے بابا کی یاد میں جلنے والی ایک شمع تھی جو اچانک ہی بجھ گئی۔

اسی وقت آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو بے موسمی بادل کے ایک ٹکڑے نے گھیر لیا اور قید خانے کا صحن تاریکی میں ڈوب گیا لیکن زندان شام کی تاریکی میں حسین علیہ السلام کی یاد میں جلنے والی اس شمع کی روشنی امر ہو چکی تھی۔

آنے والے زمانوں میں شام کے حکمرانوں کے محلات کو صفحہ ہستی سے مٹ جانا تھا اور زندان شام کو مظلوم کربلا کی بیٹی کے دربار کی صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موجود رہنا تھا۔ ایسا دربار جہاں چوبیس گھنٹے میں کبھی رات نہیں آتی۔

☆☆☆☆☆

سفرِ شہادت

کفر و شرک کے نئے دور کے بتوں کو پاش پاش کرنے کے لیے نئے ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ان جیتے جاگتے طاقت ور بتوں کو تلواروں سے نہیں اپنے خون کی دھاروں ہی سے پاش پاش کیا جاسکتا تھا۔

—*****—

چاروں طرف سے پہاڑیوں کے حصار میں گھرے ہوئے اس شہر کا آسمان چاند کی روشنی سے منور تھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان گرد کی ایک چادر سی تنی ہوئی تھی۔ یہ گرد و غبار سارے دن حاجیوں کے قافلوں کے آنے جانے سے اُٹھتا رہا تھا۔ گرد و غبار کی اس چادر کے اس پار شروع کی تاریخوں کا چاند مغربی پہاڑیوں کے اوپر چمک رہا تھا۔ حرم کعبہ کے اردگرد مشعلوں کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سارے ماحول میں ایک گہری اداسی کا احساس ہوتا تھا۔

حساس طبیعت رکھنے والوں کے دل اس اداسی کو محسوس کرسکتے تھے۔ مکے کی ساری رونق اور ہماہمی کے باوجود ان کے دل ڈوبے ڈوبے سے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک کوئی حادثہ، کوئی المیہ، کوئی بڑا سانحہ رونما ہونے والا ہے۔

مکے میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے قافلے والوں کے ٹھہرنے کی جگہ پر بڑی رونق نظر آرہی تھی۔ سامان سفر سمیٹا جارہا تھا۔ اسلحے کے صندوق ایک جگہ کرکے رکھے

جا رہے تھے۔ بار برداری کے جانوروں کو گنا جا رہا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء کا اندازہ کیا جا رہا تھا۔ مشکیزوں کو نکال کر انہیں دیکھا جا رہا تھا کہ ان میں کہیں کوئی سوراخ وغیرہ تو نہیں۔ ایک لمبا سفر درپیش تھا۔ ایسا سفر جس کی منزل بہ ظاہر ابھی کسی کو معلوم نہیں تھی۔

اصحاب حسینؑ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کاموں میں مصروف تھے۔ اہل حرم کی قیام گاہ بالکل الگ واقع تھی۔ وہاں خاندان رسولؐ کی خواتین اگلے دن کے سفر کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ جو اس قافلے کے علم بردار تھے بذات خود ایک ایک کام کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس قافلے کی حفاظت بھی حضرت عباسؑ ہی کے ذمے تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اصحاب حسینؑ اور خاندان رسالتؐ کے نوجوانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ خاندان رسالت کے نوجوان اہل حرم والے حصے کے چاروں طرف متعین کیے گئے تھے اور اصحاب حسینؑ میں سے مختلف جوانوں کو مردانے حصے کی جانب رہ کر امام وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کی حفاظت کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

عام حاجیوں کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ حج کے اس عظیم اجتماع کے موقع پر بہ ظاہر امن وسکون کے پیچھے دہشت گردی کی کتنی گہری سازشیں مکہ معظمہ میں کروٹیں لے رہی تھیں۔ شام سے آنے والے حاجیوں میں یزیدی فوج کے تین سو تربیت یافتہ کمانڈوز حاجیوں کے روپ میں مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ یہ کمانڈوز لاکھوں حاجیوں کے ہجوم میں گھل مل گئے تھے اور نواسۂ رسولؐ پر مہلک وار کرنے کے لیے مناسب موقع کے منتظر تھے۔

امام حسین علیہ السلام اس سازش سے آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یزیدی فوج کے یہ تربیت یافتہ سفاک درندے اپنی خفیہ ایجنسیوں کی ہدایت پر طواف کعبہ سے پہلے بھی کسی وقت مدینے سے آنے والے قافلے پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ یزیدی انتظامیہ کے لیے یہ بات آسان تھی کہ مدینے سے آنے والے قافلے پر حملہ کر کے سب کو قتل کر ڈالے اور اپنے اس اقدام کو حرم کعبہ میں امن و امان کے لیے کارروائی قرار دے کر خود کو مسلمانوں کے

سامنے سرخرو بھی کر سکے۔

امام حسین علیہ السلام کو اللہ کے گھر کی عزت و حرمت اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی اس لیے وہ مکہ معظمہ میں ایسی ہر کارروائی سے بچنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران انہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو بھی محفوظ رکھنا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان بھی کر دیں اور یزیدی انتظامیہ ان قربانیوں کو اپنی سازشوں کے جال میں چھپانے میں کامیاب بھی ہو جائے۔ مکے میں قافلہ حسینیؑ کے ارد گرد حفاظتی انتظامات اسی مقصد سے کیے گئے تھے کہ دشمنان اسلام ان کی قربانیوں پر شب خون مارنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

نواسۂ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے محافظوں کے ساتھ حرم کعبہ سے واپس اپنی قیام گاہ کی طرف آ رہے تھے۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ ان کے دوسرے بھائی اور مسلم بن عقیلؑ کے دو بھائی انتہائی ادب و احترام لیکن مکمل طور پر چوکنا ہو کر اپنے آقا و مولا حضرت امام حسین علیہ السلام کے عین عقب میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔

اسی وقت راستے کی دوسری جانب سے عمر بن عبدالرحمٰن نامی ایک شخص امام حسین علیہ السلام کی جانب بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ امام علیہ السلام کے قریب پہنچتا حضرت عباسؑ تیزی سے اس کے اور امام حسین علیہ السلام کے درمیان آ گئے۔ وہ شخص غیر مسلح تھا۔ امام حسینؑ نے محبت بھری نظروں سے اپنے جاں نثار بھائی کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے انہیں درمیان سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ شخص آگے بڑھا۔ اس نے امامؑ سے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔ امام حسین علیہ السلام نے اس سے مصافحہ کیا تو اس نے امام علیہ السلام کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے کچھ عرض کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''ضرور''۔ امام حسین علیہ السلام نے مختصر جواب دیا۔

''آقا! اگر آپ مجھے اپنا سچا خیر خواہ سمجھتے ہوں تو کچھ کہوں!'' عمر بن عبدالرحمٰن نے جھجکتے جھجکتے عرض کی۔

''یقیناً آپ ان لوگوں میں ہیں جن سے بدگمانی نہیں کی جاسکتی۔ بتائیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے کل آپ عراق کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ خدا کے واسطے اپنا ارادہ ملتوی کر دیجیے۔ عراق جانے میں آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ کیوں کہ وہاں بنی اُمیہ کے لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کا بیت المال، حکومت کا خزانہ بھی انہی کے قبضے میں ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ لوگ مال و دولت کے غلام ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی لوگ آپ کے خلاف تلوار نہ اٹھالیں!'' عمر ابن عبدالرحمٰن نے ایک ہی سانس میں اپنی ساری بات مکمل کر کے امام حسین علیہ السلام کے چہرے کی جانب دیکھا۔

مشعلوں کی روشنی میں امام حسین علیہ السلام کا چہرۂ مبارک عزم و ہمت کی تصویر بن کر جگمگا رہا تھا۔ آپ نے آگے بڑھ کر عمر بن عبدالرحمٰن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خلوص دل سے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ بہ ظاہر آپ نے عقل کے مطابق مشورہ دیا ہے لیکن آپ کی بات مانوں یا نہ مانوں، ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے۔'' امام حسین علیہ السلام نے بڑے ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں عمر بن عبدالرحمٰن کو جواب دیا اور ان کا شانہ تھپتھپا کر آگے کی جانب بڑھنے لگے۔

عمر بن عبدالرحمٰن حارث بن ہشام کے بیٹے تھے۔ انہوں نے جو مشورہ دیا تھا وہ ان کی محبت اور ان کی عقل کے مطابق تھا جب کہ امام حسین علیہ السلام جو فیصلہ کر چکے تھے وہ مصلحت و مشیت پروردگار کے مطابق تھا۔

☆☆☆

یہ ایک کشادہ جگہ تھی جہاں فرش بچھا ہوا تھا۔ چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔

مشعلوں کے کم زیادہ ہوتے شعلوں کی روشنی میں اصحاب حسینؑ اپنے آقا و مولا کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ادب و احترام کے ساتھ فرش پر بیٹھے تھے۔ مشعلوں کی روشنی محدود علاقے کو روشن کر رہی تھی۔ اس سے آگے ہر طرف چاند کی مدھم روشنی بکھری ہوئی تھی۔ چاند کی اسی مدھم روشنی میں اچانک کئی آدمیوں کے سائے آگے بڑھتے دکھائی دیے۔ حفاظت پر متعین نوجوان مشعلوں کو سروں کے اوپر کر کے سامنے سے آنے والوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ آنے والے جب مشعلوں کی روشنی میں آئے تو امام حسینؑ کے محافظوں کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا۔ آنے والے حضرت محمد بن حنفیہؓ تھے جو اس وقت اپنے آقا و مولا اور اپنے بھائی حسین علیہ السلام سے ملنے کیلئے تشریف لائے تھے۔

جناب محمد بن حنفیہؓ امیر المومنینؑ کے صاحبزادے تھے۔ ان کی والدہ کا نام خولہ اور لقب حنفیہ تھا۔ آپ جعفر ابن قیس کی بیٹی تھیں۔ امیر المومنین دشمنانِ اسلام سے ہونے والی جنگوں میں اپنے بیٹے محمد کو آگے آگے رکھتے تھے۔ بہت سے لوگ جناب محمد بن حنفیہؓ سے کہا کرتے کہ حسنؑ و حسینؑ بھی علیؑ کے بیٹے ہیں اور آپ بھی، لیکن علی ابن ابی طالبؑ حسنؑ و حسینؑ کو بچاتے ہیں اور آپ کو جنگ میں آگے کر دیتے ہیں۔

لوگ اس طرح کی باتیں کر کے انہیں اپنے والد اور بھائیوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے تھے لیکن جناب محمد حنفیہؓ ایسی باتیں سن کر مسکرا دیا کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے کہ حسنؑ و حسینؑ میرے باپؑ کی آنکھیں ہیں اور میں اپنے باباؑ کا ہاتھ ہوں۔ باباؑ اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

محمد بن حنفیہؓ اس دور میں عرب کے ان چار شجاع ترین افراد میں سے ایک تھے جن کے لیے کہا جاتا تھا کہ یہ چاروں افراد جس فوج کے ساتھ ہوں اسے شکست دینا ممکن نہیں۔ ان چار افراد میں حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، محمد بن حنفیہؓ اور مسلم بن عقیلؑ جیسے بہادر لوگ شامل تھے۔ محمد بن حنفیہؓ کو حضرت امام حسین علیہ السلام نے مدینے میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قافلہ حسینی میں شامل نہ ہوتے۔ اس وقت ان کا مدینے میں

ٹھہرنا ہی ضروری تھا۔ مدینے سے روانگی کے وقت بھی جناب محمد بن حنفیہؓ نے امام حسین علیہ السلام کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن علیؑ ابن ابی طالبؑ کے بہادر اور پاک باز بیٹے ہونے کے باوجود محمد بن حنفیہؓ امام معصوم نہیں تھے۔ وہ اپنے بھائی کو جو مشورہ دے رہے تھے وہ اپنی عقل، خلوص اور انسانی فطرت کے مطابق دے رہے تھے۔

جناب محمد بن حنفیہؓ اندر داخل ہوئے تو حضرت عباس علیہ السلام اور امیر المومنینؑ کے دوسرے بیٹے جعفرؓ، عبداللہؓ، عثمانؓ، عمرؓ اور محمدؓ بھی بھائی کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ محمد حنفیہؓ نے سب کو گلے سے لگا کر پیار کیا اور سیدھے حضرت امام حسین علیہ السلام کی مسند کے قریب پہنچے۔ امام علیہ السلام نے کھڑے ہو کر انہیں سینے سے لگایا۔ انہیں اپنے قریب جگہ دی۔

"بھائی! بڑی خوشی ہوئی تمہارے یہاں آنے سے۔" آپؑ نے خوش دلی سے کہا۔

محمد بن حنفیہؓ کی آنکھیں امامؑ کے چہرہ مبارک کا طواف کر رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو امنڈے پڑتے تھے۔ "بھائی! آپ کوفے والوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے باباؑ کے ساتھ بھی بے وفائی کی اور بھائی حسنؑ کے ساتھ بھی۔۔۔" محمد بن حنفیہؓ کی آواز میں عجیب طرح کا کرب تھا۔

امام حسین علیہ السلام کے چہرے پر عزم و یقین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"بھائی! آپ کوفے نہ جائیں۔ وہ آپ کے ساتھ بھی بے وفائی کریں گے۔ آپ یہیں رہیں مکے میں۔ آپ تو اس حرم کے عزیز ترین افراد میں سے ہیں۔" یہ کہتے کہتے محمد بن حنفیہؓ جیسے بہادر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

امام حسین علیہ السلام نے انہیں اپنے قریب کیا۔ "محمد! میں مکے میں رک سکتا تھا لیکن یزید ابن معاویہ سے بعید نہیں کہ وہ مجھے اچانک حرم ہی میں قتل نہ کرادے۔ اگر ایسا ہوا تو میری وجہ سے یہاں بہت خوں ریزی ہوگی۔ میری وجہ سے خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہو، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔" امام حسین علیہ السلام نے محمد بن حنفیہؓ کو سمجھایا۔ اس کے بعد آپ نے حاجیوں کے بھیس میں یزیدی فوجیوں کی مکہ معظمہ میں موجودگی کے بارے میں

انہیں تفصیل سے بتایا۔

"اگر آپ کو یہاں جان کا خوف ہے تو عراق کی بجائے یمن کے طرف چلے جائیے وہاں ہزاروں تلواریں آپ کے ساتھ ہوں گی۔" محمد بن حنفیہؓ نے دوسری رائے پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا"۔ امام حسین علیہ السلام نے ان کی محبت دیکھتے ہوئے ان سے کہا۔

محمد بن حنفیہؓ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور تھے اور سید الشہداء حضرت امام حسینؑ مشیت الٰہی اور اپنے بچپن کے وعدے کے پابند۔ محمد بن حنفیہؓ کی نظریں مستقبل قریب کو دیکھ رہی تھیں لیکن امامِ وقت کی نگاہیں قیامت کے دن تک کے حالات و واقعات پر جمی ہوئی تھیں۔

محمد بن حنفیہؓ سمجھ رہے تھے کہ حسین علیہ السلام کو اپنی جان کا خوف ہے وہ امام حسین علیہ السلام کے اقدامات کے پیچھے چھپی ہوئی بصیرت کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔

امام حسینؑ اپنی جان بچانے کیلئے مکے سے نہیں نکل رہے تھے بلکہ اپنی جان کو ایک خاص وقت، مقام اور مقصد پر قربان کرنے کیلئے مکے سے روانہ ہو رہے تھے۔ اس وقت وہ اپنی اور اپنے جاں نثاروں کی زندگی کو بچانا چاہتے تھے کہ مناسب موقع پر ان جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان کیا جائے۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا۔ مکے کے گلی کوچے حاجیوں کے رش کی وجہ سے آباد تھے۔ امام حسین علیہ السلام نمازِ فجر سے فارغ ہوئے تھے کہ رسول اللہؐ کے چچا جناب عباس ابن عبدالمطلبؑ کے بیٹے عبداللہ ابن عباسؓ امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

عبداللہ ابن عباسؓ امیر المومنینؑ کے شاگرد رشید بھی تھے اور چچا زاد بھائی بھی۔ تفسیر قرآن اور علم حدیث انہوں نے امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہی سے حاصل کیا تھا۔ بے پناہ ذہین اور حاضر جواب انسان تھے۔ نبی کریمؐ کے زمانے میں کم عمر تھے لیکن اللہ

کے رسولؐ کے لئے مختلف خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ کے فرشتے جبرائیلؑ کو بھی دیکھا تھا جو اس وقت ایک خوب صورت آدمی کی شکل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ سن ساٹھ ہجری میں آپ بوڑھے ہو چکے تھے اور ان دنوں مناسک حج کی ادائیگی کیلئے مکہ معظمہ آئے ہوئے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کی دست بوسی کے بعد عبداللہ ابن عباسؓ نے عرض کی۔ ''نواسہ رسولؐ! خدا کے واسطے اپنے ارادے کو تبدیل کر دیں۔ کوفے والوں ہی نے آپ کے والد کو شہید کیا۔ آپ کے بھائی بھی انہی کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ وہ آپ کے ساتھ بھی بے وفائی کریں گے۔''

''میں جانتا ہوں... لیکن یہ دیکھئے'' امام حسین علیہ السلام نے اپنے غلام کو اشارہ کیا تو اس نے کوفے والوں کے خطوط سے بھرے ہوئے دو تھیلے عبداللہ ابن عباسؓ کی طرف بڑھا دیئے۔

''یہ دیکھئے! یہ سارے خطوط مجھے کوفے والوں نے لکھے ہیں۔ مسلمؑ بن عقیلؑ کا اطمینان بخش خط بھی عابسؓ شاکری لے کر یہاں آ چکے ہیں۔'' حضرت امام حسینؑ نے کہا۔

''اچھا جیسے آپ کی مرضی لیکن اگر آپ کوفے جانے کا پکا ارادہ کر ہی چکے ہیں تو کم از کم عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جایئے۔ میں ڈرتا ہوں کہ دشمن آپ کو قتل کر دیں گے اور یہ اندوہناک منظر ان عورتوں اور بچوں کو دیکھنا پڑے گا۔''

''ایسا ممکن نہیں۔ اہل حرم میرے ساتھ جائیں گے۔'' امام حسین علیہ السلام نے حتمی انداز سے جواب دیا۔ امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ قافلہ شہادت میں خواتین اور بچے شامل نہ ہوئے تو قاتلوں کے نام، یزیدی فوج کے مظالم اور خود ان کی عظیم قربانیاں سبھی کچھ تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو جائے گا۔

''ویسے یہ عرض کر دوں کہ آپ نے ابن زبیر کی دلی خواہش پوری کر دی کہ خود اپنے قدموں سے چل کر مکے سے عراق کی طرف جا رہے ہیں۔ حجاز کا علاقہ آپ سے خالی ہو گا

تو عبداللہ ابن زبیر یہاں اپنا مقصد آسانی سے حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔"
عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا۔

امام حسین علیہ السلام نے ان کی بات کو اہمیت نہ دی اور فرمایا: "آپ نہیں جانتے لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرے اصحاب و انصار کی قتل گاہ وہیں بنے گی۔"

☆☆☆

جناب عبداللہ ابن عباسؓ اقتدار کے ایوانوں اور عرب کے بادشاہ گر طبقوں میں بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ عرب کی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ جس خدشے کا اظہار کر رہے تھے وہ بے جا نہیں تھا۔ بعد میں ہوا بھی ایسا ہی۔ واقعہ کربلا کے کچھ عرصے بعد عبداللہ ابن زبیرؓ نے مکے میں یزیدی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ سن ۶۴ ہجری میں شام سے مسلم بن عقبہ کو عبداللہ ابن زبیرؓ کی سرکوبی کیلئے روانہ کیا گیا لیکن وہ مکے پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے حصین بن نمیر کو اپنا قائم مقام مقرر کر دیا۔

حصین بن نمیر نے مکے آ کر پہاڑیوں پر منجنیقیں نصب کرائیں اور ان کے ذریعے خانہ کعبہ پر آگ اور پتھروں کی بارش برسانا شروع کر دی جس سے غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی اور حرم کعبہ کے چاروں طرف پتھروں کا ڈھیر لگ گیا۔ اس نے چالیس روز تک مکے شہر کا محاصرہ کئے رکھا۔ اسی دوران میں یزید واصل جہنم ہو گیا۔ یزیدی لشکر میں بددلی پھیل گئی اور عبداللہ ابن زبیرؓ کو مکے سے فرار ہو کر مدینے پہنچ جانے کا موقع مل گیا۔

امام حسین علیہ السلام اسی لئے مکہ معظّمہ کو چھوڑ کر جا رہے تھے کہ کہیں یزیدی فوجیں مکے ہی میں ان پر حملہ آور نہ ہو جائیں اور امن کے شہر مکہ معظّمہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ یہاں خون نہ بہے۔

عبداللہ ابن عباسؓ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد عبداللہ ابن عمرؓ جو خلیفۂ ثانی کے بیٹے تھے امام عالی مقامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ بھی ان افراد میں شامل تھے جنہوں نے

یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔

''میری رائے یہ ہے کہ آپ فی الحال ان گمراہ لوگوں سے کوئی سمجھوتا کر لیجئے۔ کیوں کہ اگر جنگ ہوئی تو آپ ان سے نہیں جیت سکیں گے۔'' انہوں نے امام حسینؑ کو ایک نئی راہ دکھانا چاہی۔

امام حسینؑ ان کے دل کا حال جانتے تھے آپ نے انتہائی نرمی سے فرمایا۔ ''دنیا کے حقیر ہونے کا یہ ثبوت ہی کافی نہیں کہ یحییٰؑ ابن زکریاؑ جیسے نبی کا سر کاٹ کر بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کو تحفے کے طور پر بھیجا گیا''۔

عبداللہ ابن عمرؓ امامِ وقتؑ کو دنیاوی کامیابی اور ناکامی کے حوالے سے نفع نقصان سمجھانا چاہ رہے تھے لیکن امام حسین علیہ السلام نے دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کی مثال دی اور فرمایا۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے صبح سے شام تک اللہ کے ستر پیغمبروں کو قتل کیا تھا اور اپنے روز مرہ کے کاموں میں ایسے مشغول رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اللہ نے اس عظیم گناہ کے بدلے میں انہیں فوری طور پر سزا نہیں دی لیکن جب سزا کا وقت آیا تو ان سے بھرپور انتقام لیا۔ عبداللہ! اللہ سے ڈرو اور میری مدد کرنے سے گریز نہ کرو۔'' امام عالی مقامؑ نے فرمایا۔

نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر یزیدی حکومت سے کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح کے انداز سیاست کا وقت گزر چکا تھا۔ سن ساٹھ ہجری کے حالات سن پچاس ہجری کے حالات سے مختلف تھے۔ پہلے زمانے کے منافقین ڈھکے چھپے انداز میں دین اسلام کا مذاق اڑا رہے تھے لیکن سن ساٹھ ہجری کا ''خلیفۃ المسلمین یزید ابن معاویہ'' کھلے عام شراب پیتا، کتوں کے ساتھ کھاتا پیتا اور برسرِ دربار قرآن و حدیث اور خدا اور رسولؐ کا مذاق اڑاتا تھا۔

ساری دنیا ایسے بدکردار انسان سے مصالحت کر سکتی تھی لیکن نواسۂ رسولؐ کے لیے ایسا ممکن نہیں تھا اس لئے کہ اس وقت وہ صرف نواسہ رسولؐ ہی نہیں انسانوں کی رہبری کرنے

والے امام وقتؑ بھی تھے۔ اگر آپؑ اسلام کے پردے میں چھپے ہوئے ایک بدترین گناہ گار اور ظالم حکمران سے کسی قسم کی مصالحت کر لیتے یا اس کے تمام مظالم کو نظر انداز کر کے یمن کے پہاڑی علاقوں میں کہیں روپوش ہو جاتے تو یزیدی انتظامیہ اور اس کی پروپیگنڈا مشینری امام حسین علیہ السلام کی اس خاموشی کو یزیدی بادشاہت کیلئے ان کی نیم رضامندی ظاہر کرتی اور اس کے نتیجے میں ساری ملت اسلامیہ یزید کے سامنے سر بہ سجود ہو جاتی۔

☆☆☆

حاجیوں کی آمد و رفت کی وجہ سے سارے مکے پر گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی۔ مختلف شہروں اور ملکوں کے حاجی، قافلوں کی شکل میں میدان عرفات کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس وقت ایک مختصر سا قافلہ حج جیسے فریضے کو مجبوراً چھوڑ کر عراق کے صحرا میں ایک نیا شہر آباد کرنے، قربانی کا ایک نیا میدان سجانے مکے سے نکل کر مکے اور میدان منیٰ کے درمیان واقع ابطح نامی مقام سے گزر رہا تھا۔

اصحاب حسینؑ کی سواریاں قافلے کے آگے تھیں۔ درمیان میں امامِ وقتؑ، ولی عصرؑ حضرت امام حسین علیہ السلام ایک گھوڑے پر سوار، باگیں اپنے ہاتھوں میں تھامے اپنے گھوڑے کو مناسب رفتار کے ساتھ دوڑا رہے تھے۔ ان کے چاروں جانب جانثاروں کا حلقہ تھا جس کی سربراہی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بیٹے ابوالفضل العباسؑ کے سپرد تھی۔ ان بہادروں کے عین عقب میں خاندان رسالتؐ کی عماریاں تھیں۔ ان عماریوں میں علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں، بہوویں، بچے اور رسول اللہؐ کی نواسیاں سفر کر رہی تھیں۔ ان عماریوں کے اردگرد بنی ہاشم کے بہادر گھڑ سواروں نے ایک حفاظتی حصار بنا رکھا تھا۔

میدان کی ہوا گرم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میدانوں میں ہوا کے بگولے چکراتے پھر رہے تھے۔ قافلہ حسینیؑ بہ ظاہر سو دو سو مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا لیکن امام وقت حضرت امام حسین علیہ السلام اللہ کے فرشتوں، اور کفر و شرک کے نئے دور میں ظلم و ستم کا شکار ہونے والے شہیدوں کی پاکیزہ روحوں کو بھی اپنے ساتھ سفر کرتے دیکھ رہے تھے۔

صحرائی ہوا کے جھونکوں کے درمیان بہت سی آوازیں، سسکیاں اور دل دوز بین کرنے کی آوازیں پھیلی ہوئی تھیں۔

کبھی خاک اڑاتے صحراؤں میں کسی خاتون کی آواز گونجنے لگتی۔ ''اے محمد مصطفیٰؐ اے میرے باباؐ! آپ کی امت نے میرے بیٹے کو آپ کی قبر اور اللہ کے گھر سے جدا کر دیا۔ بابا...... ! میرا بیٹا اپنی قتل گاہ کی جانب بڑھ رہا ہے۔ بابا! وحشی درندے کربلا کے میدان میں میرے حسینؑ کے جسم کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو بے چین ہیں۔''

کبھی دورانِ سفر امام حسینؑ کو اپنے بہادر باپ کا چہرہ نظر آتا۔ علیؑ ابن ابی طالبؑ کی آنکھیں آنسوؤں سے سرخ ہوتیں لیکن وہ اپنے سارے دکھوں کو چھپا کر اپنے چھوٹے بیٹے کی ہمت افزائی کرتے۔ ''بیٹا آگے بڑھتے رہو۔ بچپن کے وعدے کو وفا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ گھبرانا نہیں میں ہر لمحے تمہارے ساتھ ہوں۔''

کبھی صحرا کی یہ سناٹا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گلوگیر آواز سے گونجتا محسوس ہوتا۔ ''حسین! تم تو میرے وجود کا ٹکڑا ہو۔ جو تکلیف تمہیں پہنچے گی وہی تکلیف میں بھی محسوس کروں گا لیکن اب دین اسلام کو مسخ ہونے سے بچانے کیلئے تمہاری قربانی ناگزیر ہے۔ میرے بیٹے! ابراہیمؑ نے اپنے لختِ جگر کی قربانی کرنا چاہی تھی لیکن اللہ نے اسے ذبح عظیم میں بدل دیا تھا کہ اللہ کسی کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر مصیبت میں مبتلاء نہیں کرتا۔ میرے بیٹے! وہ ذبح عظیم میرے لئے ملتوی کی گئی تھی کہ وہ ذبح عظیم تو تم ہو میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔ میں تمہیں اپنی آنکھوں سے بھوکا پیاسا ذبح ہوتے دیکھوں گا اور تم اپنے نورِ نظر علی اکبرؑ کو خون میں نہاتا دیکھو گے۔ اپنے جوان بیٹے کے کلیجے سے برچھی نکالنا تمہارا ہی کام ہوگا حسین!''

لُو کے تھپیڑوں، بادبگولوں کی اُڑتی ہوئی گرد اور ہوا کے جھونکوں میں کبھی اپنے بڑے بھائی حسنؑ کا آنسوؤں سے تر بہ تر چہرہ امام حسین علیہ السلام کو دکھائی دینے لگتا۔ ''حسین! میرا زمانہ اور تھا۔ اُس وقت اگر تم امام وقت ہوتے تو وہی کرتے جو میں نے کیا اور اِس

وقت اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو وہی راستہ اختیار کرتا جو راستہ تم نے اختیار کیا ہے۔

تم آگے بڑھتے رہو!۔ دنیا والوں کے کہنے کی پرواہ نہ کرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ حالات اسی طرح چلتے رہیں تاکہ انہیں کسی آزمائش میں نہ پڑنا پڑے۔ ان کے کاروبار چلتے رہیں ان کے گھر آباد رہیں۔ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ یہ دنیا سے بھی فائدے اٹھاتے رہیں اور بڑی بڑی مذہبی باتیں کر کے، ظاہری عبادات انجام دے کر اپنی دانست میں اپنی آخرت کو بھی بچالے جائیں۔

یہ تم ہی ہو حسین! کہ حق کو باطل سے اسلام کو کفر سے اور سچ کو جھوٹ سے واضح طور پر الگ الگ کر کے دکھانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

نواسہ رسولؐ، امام مظلومؑ، حسین ابنِ علی علیہ السلام ان آوازوں، بزرگوں کی سرگوشیوں اور کفر و شرک کے نئے دور میں شہید ہونے والے مظلوموں کی پاکیزہ روحوں کی فریادیں سن رہے تھے اور اپنی قربانیوں کو ساتھ لیے اپنی قربان گاہ کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کی منزل کربلا تھی۔ انہیں اپنی اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی قربانیاں اللہ کی راہ میں پیش کر کے بت پرستی کے نئے دور میں پیدا ہونے والے جیتے جاگتے شیطانی بتوں کو پاش پاش کرنا تھا۔

ان نئے طاقت ور بتوں کو توڑنے کیلئے نئے ہتھیار درکار تھے۔ ان جیتے جاگتے محلوں، فوجوں اور لشکروں والے چالاک، سفاک اور مکّار بتوں کو تلواروں سے نہیں اپنے خون کی دھاروں سے پاش پاش کیا جا سکتا تھا اور حسین علیہ السلام اس اسلحے سے پوری طرح لیس تھے!

☆☆☆☆☆

یزیدی سازش

سنت ابراہیمیؑ پر عمل کرنا آسان تھا لیکن جذبہ ابراہیمیؑ پر عمل کرنا بہت مشکل کام تھا کہ اس میں چوپایوں کی نہیں خود اپنی اور اپنی آنکھوں کے تاروں اور دل کے سہاروں کی قربانی پیش کرنا پڑتی تھی۔

—*****—

مصر، شام، ایران، عراق، یمن اور دوسرے علاقوں سے لاکھوں مسلمان اللہ کے گھر کا طواف کرنے کی آرزو دلوں میں بسائے مکہ معظّمہ پہنچ چکے تھے۔ شہر کے گلی کوچے مسلمانوں کے مختلف قافلوں کے آنے کی وجہ سے انسانوں سے چھلکے پڑ رہے تھے۔ ان سارے مسلمانوں کو احرام باندھ کر آٹھ ذی الحجہ کو مراسم حج کا آغاز کرنے میدان عرفات کی طرف جانا تھا۔ اس میدان میں انہیں ایک رات قیام کر کے اگلے دن مشعر الحرام نامی وادی میں ایک رات بسر کرنا تھی۔ دس ذی الحجہ کی صبح انہیں منیٰ کے میدان میں پہنچنا تھا۔

یہاں دو دن کے قیام کے دوران انہیں تین شیطانوں کو پتھر مارنا تھے۔ اسی میدان میں انہیں اللہ کی راہ میں بھیڑوں اور دنبوں کی قربانی کر کے اپنے سر منڈوانا تھے۔ اس کے بعد انہیں اللہ کے گھر کا طواف، نماز اور صفا و مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان سعی کر کے طواف النساء انجام دینا تھا۔

شہر کے مختلف راستوں سے قربانی کے جانوروں کی بہت بڑی تعداد منیٰ کے میدان

پہنچائی جارہی تھی۔ اونٹ، بھیڑ، بکرے اور دنبے منیٰ کے میدان میں جمع ہورہے تھے۔ ان جانوروں کو اللہ کی راہ میں قربان ہونا تھا۔ قربانی کی یہ صدیوں پرانی رسم اللہ کے اولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد دلاتی تھی۔

سن ساٹھ ہجری کے اس حج کے موقع پر بھی سنت ابراہیمی پر عمل کرنے کی تیاریاں پورے مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ ہورہی تھیں۔ مسلمانوں کی اکثریت ہر سال اسی طرح لاکھوں دنبے، بکرے اور اونٹ قربان کیا کرتی تھی۔ جانوروں کو قربان کرنے میں وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

اس وقت سنت ابراہیمؑ، زندہ تھی لیکن مسلمانوں کے دل جذبہ ابراہیمؑ سے خالی ہوچکے تھے۔ سنت ابراہیمؑ پر عمل کرنا آسان تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت آج بھی سنت ابراہیمؑ پر عمل کرنے کو تیار تھی لیکن جذبہ ابراہیمؑ پر عمل کرنا بہت مشکل کام تھا کہ اس میں چوپایوں کی نہیں خود اپنی اور اپنی آنکھوں کے تاروں اور دل کے سہاروں کی قربانی پیش کرنا پڑتی تھی۔

سن ساٹھ ہجری کے موسم حج میں جب حاجیوں کے قافلے اپنے چوپایوں کی قربانیاں پیش کرنے میدان عرفات اور منیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے، اس وقت حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد میں سے کچھ لوگوں کا ایک قافلہ قربانی کے ایک نئے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے صدیوں پہلے کعبے کی دیواروں کو بلند کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے دعا کی تھی کہ اے ہمارے پالنے والے! ہماری اولاد میں سے ایک گروہ پیدا کر جو تیرا فرماں بردار ہو۔

یہ وہ لوگ تھے جو دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ انہی کے لئے دعا کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پروردگار سے عرض کی تھی کہ میرے پالنے والے مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم ان بتوں کی پرستش کرنے لگیں۔ اے میرے پالنے والے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان بتوں نے بے شمار انسانوں کو گمراہ کردیا ہے۔

آٹھ ذی الحجہ کو میدان عرفات کی طرف جانے کی بجائے عراق کی جانب بڑھنے والا

یہ قافلہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان اور ان کے راستے پر چلنے والے ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ یہ قافلہ نواسہ رسولؐ حسینؑ ابن علیؑ کی قیادت میں منزل ابطح کی طرف بڑھ رہا تھا۔

حسینؑ ابن علیؑ جانتے تھے کہ اس وقت حج کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے یا کعبے کی حرمت کو بچانا اس وقت زیادہ ضروری ہے۔

کعبے کی حرمت کو برباد کرنے والے مٹی اور پتھر کے بتوں کو حسین علیہ السلام کے والد حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ فتح مکہ کے موقع پر پاش پاش کر چکے تھے لیکن حسینؑ ابن علیؑ کو جیتے جاگتے بتوں کا سامنا تھا۔

فتح مکہ کے موقع پر مٹی اور پتھر کے بت زمین بوس ہوئے تو شیطان نے مکے کے بت پرستوں کے لیے نئے بت تراشنا شروع کردیے۔ شیطان نے انہیں گمراہ کرنے کیلئے نئے زمانے، نئے دور اور نئی ضروریات کے مطابق ایسے جیتے جاگتے بت تراش کر ان کی درمیان رکھ دیئے جو دنیا کو دکھانے کیلئے نماز بھی پڑھتے تھے، کعبے کا طواف بھی کرتے تھے اور اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی ہی نہیں اختلاف کرنے والوں کے سر اڑانے کی بھی طاقت رکھتے تھے۔ یہ کفر وشرک کا نیا دور تھا جو سن ساٹھ ہجری میں اپنے عروج کو چھو رہا تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ جیسے بت شکن کی اولاد میں پیدا ہونے والے گروہ کے ایک فرد تھے۔ وہ شیطان کی اس نئی چال کو سمجھ رہے تھے۔ وہ وارثِ ابراہیمؑ تھے۔ ان کیلئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ نئے زمانے کے انسانوں کو گمراہ کرنے والے بتوں کو برداشت کرسکیں۔

لیکن ان بتوں سے مقابلہ آسان بھی نہ تھا۔ ان بتوں کو توڑنے کیلئے سنت ابراہیمیؑ کی نہیں جذبہ ابراہیمیؑ کی ضرورت تھی۔ اس کیلئے جانوروں کی نہیں اپنی گود کے پالوں، آنکھ کے تاروں، سینے پر سونے والوں، اپنے پیاروں اور خود اپنی قربانی کی ضرورت تھی اور اس وقت حسین علیہ السلام اپنی ان سب قربانیوں کو ساتھ لے کر اپنی قربان گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

بنو اُمیہ کی خفیہ ایجنسیوں نے طواف کے دوران عین حرم کعبہ میں نواسہ رسولؐ کو قتل کر کے امن کے شہر مکہ معظمہ میں زبردست خون ریزی اور نواسہ رسولؐ کے قتل کا الزام خلافت کے دو دوسرے دعوے داروں عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ پر عائد کر کے صحابہؓ کے ان دونوں بیٹوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا جو بھیانک منصوبہ بنایا تھا، نواسہ رسولؐ اس سارے منصوبے کو خاک میں ملا کر حج سے دو دن پہلے ہی مکہ معظمہ سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

روانگی سے ایک دن پہلے شام کے وقت جب حاجیوں کے قافلے میدان عرفات کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہے تھے، حضرت امام حسین علیہ السلام نے مدینے سے ساتھ آنے والوں اور نئی حکومت کے ذریعے دنیاوی مال و دولت کی غرض سے مکے میں اپنے گرد جمع ہو جانے والوں کے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"موت اولاد آدمؑ کیلئے ایسی ہی ہے جیسے کسی لڑکی کے گلے میں گلوبند۔ میں اپنے بزرگوں سے ملاقات کیلئے اتنا ہی بے تاب ہوں جیسے یعقوبؑ کو یوسفؑ کا دیدار کرنے کی بے تابی تھی۔"

دن بھر آگ برساتا سورج مکے کی پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس وقت شفق کی سرخی نے سارے مشرقی افق کو لالہ رنگ کر رکھا تھا۔ امام حسین علیہ السلام ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ہجوم سے خطاب کر رہے تھے۔ شفق کی لالی آپ کے چہرہ مبارک کی روشنی کے ساتھ مل کر عجیب رنگ پیدا کر رہی تھی۔

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام بے پناہ خوب صورت انسان تھے۔ دراز قد سرخ و سفید چہرہ، سیاہ کشادہ آنکھیں، روشن پیشانی، سیاہ عمامہ، مضبوط ہاتھ پاؤں، چہرے پر بے پناہ رعب و جلال۔ آپؑ کا چہرہ مبارک ایسا روشن تھا کہ اگر آپ اندھیرے سے گزرتے تو آپ کے چہرے کی روشنی سے اندھیرے میں ہلکا ہلکا اجالا پھیل جایا کرتا تھا۔

اس وقت شفق کی سرخ روشنی آپ کے چہرے کی روشنی کے ساتھ مل کر تازہ تازہ خون کی طرح چمک رہی تھی۔ سننے والوں کی آنکھیں اس عجیب و غریب منظر میں کھوئی ہوئی تھیں لیکن جیسے ہی آپ نے اپنی تقریر کا پہلا جملہ کہا تو دنیاوی حکومت اور مال و دولت کی خاطر آپ کے اردگرد جمع ہونے والوں کو اپنی ساری امیدیں خاک میں ملتی نظر آئیں۔ ان کے دل بجھ سے گئے۔

اس کے برعکس مدینے سے آپ کے ساتھ آنے والے بیٹوں، بھائیوں اور دوستوں کے دل اپنے آقا و مولا کی محبت میں تیز تیز دھڑکنے لگے۔ وہ ٹکٹکی باندھے اپنے آقا و مولا کو دیکھے جا رہے تھے۔ عقیدت و محبت کے آنسوؤں نے ان کی آنکھوں میں ہزاروں رنگ بھر دیئے۔
شفق کی سرخی ہلکی ہلکی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی اور امام حسین علیہ السلام کی آواز گونج رہی تھی۔

"میری قتل گاہ اور مدفن پہلے سے طے ہو چکا ہے اور مجھے بہر حال وہاں پہنچنا ہے۔ یہ سمجھ لو جیسے میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ سرزمین کربلا میں بیابان کے درندے میرے اعضاء کو الگ الگ کر کے اپنے پیٹ بھر رہے ہیں۔
تقدیر کے لکھے سے فرار ممکن نہیں ہے لیکن ہم ہر حال میں اللہ کی مرضی پر راضی ہیں۔ ہم اس کے ہر امتحان، ہر آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہمیں صبر کرنے والوں کا اجر و ثواب عطا کرتا ہے (اس لئے اب) جو شخص ہماری راہ میں اپنی جان قربان کرنے اور اپنے پروردگار سے ملاقات کیلئے خود کو تیار سمجھتا ہو وہ ہمارے ساتھ آئے۔ میں ان شاء اللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

سورج کی سرخ تھالی پہاڑوں کے عقب میں ڈوب چکی تھی۔ مکے کے پہاڑوں کی چوٹیاں مٹیالے رنگ کی ہوگئی تھیں۔ اندھیرے کی چادر مشرقی افق سے سارے آسمان پر پھیلتی

چلی جارہی تھی اور دنیا کے مال و دولت کے پجاری اس تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سازو سامان کے ساتھ اس تاریکی کا حصہ بنتے جارہے تھے اسی لئے مغرب کی نماز شروع ہوئی تو جماعت میں سید الشہداءؑ کے پیچھے صرف وہی لوگ اللہ کے آگے سر بہ سجود تھے جو اپنے سروں کو اللہ کی راہ میں کٹوانے کیلئے مدینے سے نواسہ رسولؐ کے ساتھ آئے تھے یا مسلمؑ بن عقیلؑ کے قاصد کے ساتھ کوفے سے یہاں پہنچے تھے اور ہمیشہ کے لئے اس قافلہ شہادت میں شامل ہوگئے تھے۔

☆☆☆

اللہ کے بندوں کو مٹی اور پتھر کے بے جان بتوں کے ذریعے گمراہ کرنے کے شیطانی مکروفریب کا پردہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے بڑے بیٹے حسنؑ ابن علیؑ اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے انداز میں چاک کرتے رہے تھے۔

لیکن رسولؐ کے دوسرے نواسے اور علیؑ و فاطمہؑ کے چھوٹے بیٹے کو مٹی، پتھر اور لکڑی کے بے جان بتوں کو نہیں بے شمار جیتے جاگتے شیطانی بتوں کو پاش پاش کرنا تھا۔ یہ چالاک اور سفاک بت حجاز مقدس سے مصر، شام اور عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔

تہہ در تہہ سازشوں کے جال بچھانے والے ان چالاک سفاک شیطانی بتوں کو پاش پاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بنو اُمیہ کی حکومتی مشینری ذرا سی بات کا بتنگڑ بنانے اور اپنے بڑے بڑے جرائم کو چھپانے کا فن جانتی تھی۔ بنو امیہ کی بیورو کریسی اور خفیہ ایجنسیاں بدترین مجرم کو قوم کا ہیرو اور اسلام سے محبت کرنے والے شہید کو قصوروار بنانے کی ماہر تھیں۔

پبلسٹی اور رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے سارے میڈیا، تمام چینلز ان کے کنٹرول میں تھے۔ قلم خریدے جاچکے تھے، حدیث بیان کرنے والے یا تو خاموش تھے یا فروخت ہوچکے تھے۔ شام، عراق اور حجاز میں سچ بولنے والوں کی گردنیں قلم کی جاچکی تھیں۔ حق کا ساتھ دینے والوں کو نمونہ عبرت بنادیا گیا تھا۔ رسول اللہؐ کے صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد دنیا سے

اُٹھ چکی تھی اور جو بزرگ زندہ تھے انہیں مال یا تلوار کے ذریعے خاموش کر دیا گیا تھا۔

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام بنو اُمیہ کی سازشوں کو اچھی طرح جانتے تھے اسی لیے آپؑ نے اپنی شہادت سے پہلے اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام واقعات کا اندازہ لگانے کے بعد ایک سوچا سمجھا منصوبہ ترتیب دیا تھا تاکہ ان کی فکر اور پیغام کو پھیلنے سے روکنے کے لیے یزیدی بیورو کریسی اور خفیہ ایجنسیوں کی تمام سازشیں ان کے شہادت کے بعد بھی بے نقاب ہوتی رہیں۔

مدینے سے مکے اور مکے سے کربلا میں عصر عاشور تک آپ کا ہر قدم سوچا سمجھا اور ہر خطاب باطل کی سازشوں سے پردہ اُٹھانے کے لیے کافی تھا۔ مکے سے روانگی سے ایک دن پہلے آپ نے جو کچھ فرمایا اس کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں تھے جو اس وقت مکے میں آپ کا خطبہ سن رہے تھے۔ اس کے مخاطب دراصل تمام مسلمان اور خاص طور پر یزید کے شیطانی منصوبہ ساز تھے۔

امام حسینؑ کے مکے میں قیام کے دوران یزیدی انتظامیہ نے کوفے سے آپ کے نام ہزاروں جعلی خط لکھوائے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ ہم بغیر امام کے ہیں۔ آپ آکر ہماری رہنمائی کریں اور یزیدی گورنر سے حکومت چھین لیں۔ ان میں سے زیادہ تر خطوط خود یزیدی فوجیوں نے لکھے تھے یا کوفے کے ان لوگوں نے تحریر کیے تھے جو شیعیان علی نہیں تھے لیکن بنو اُمیہ کی جانب سے کوفے میں مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابیہ جیسے سفاک گورنروں کی تعیناتی کی وجہ سے شامی حکومت سے سخت ناراض تھے۔ یہ خط حبِّ علیؑ میں نہیں بغض معاویہ میں لکھے گئے تھے۔

کوفے میں حکومت کی طرف سے مصنوعی آزادی، وہاں کے عام لوگوں کی بدلتی ہوئی سوچ اور نواسہ رسولؐ کے مکے میں تین ماہ ٹھہرے رہنے کی خبروں کی وجہ سے کوفے میں شیعیان علیؑ کی مختصر سی تعداد بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی کہ ظالم حکومت کے بدلنے کا وقت آ گیا ہے۔ اسی لیے اہل بیتؑ سے حقیقی محبت کرنے والے کئی افراد نے بھی امام حسینؑ کو خط

تحریر کیے تھے۔

ان خطوط کے ملنے کے بعد امام حسین علیہ السلام نے مکے سے اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ بن عقیل کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفے روانہ کردیا اور آٹھ ذی الحجہ کو آپ خود بھی اپنے اہل حرم کے ساتھ عراق کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔

لیکن کوفے کے لیے امامِ عالی مقامؑ کی روانگی دنیا کی حکومت اور مال و دولت کے لیے ہرگز نہیں تھی۔ مدینے سے نکلتے وقت ہی نہیں اپنی پیدائش کے دن سے اپنی اور اپنی اولاد، اعزہ اور اصحاب کی شہادت کی خبر آپ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ آپ کسی دھوکے یا فریب کا شکار ہوکر کوفہ نہیں جارہے تھے۔ اس سفر کا انجام آپ کو اپنے ناناؐ اور اپنے ماںؑ باپؑ کے ذریعے، بہت پہلے معلوم ہوچکا تھا۔

مکے سے روانگی سے پہلے کربلا میں اپنی شہادت اور بیابان کے درندوں کے ذریعے اپنے اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی پیش گوئی آپ نے اس لیے کی تھی کہ آپؑ کی شہادت کے بعد یزیدی منصوبہ ساز، خفیہ ایجنسیاں اور چالاک بیوروکریسی یہ پروپیگنڈا نہ کرسکے کہ ''علم امامت'' رکھنے والا رسولؐ کا نواسہ ہمارے بنائے ہوئے دھوکے کے جال میں پھنس کر کربلا آ گیا اور ہم نے اسے قتل کرڈالا۔ یہ ہمارا ایک منصوبہ تھا اور حسینؑ بغیر سوچے سمجھے اس کا شکار ہوگئے۔

شیطان اپنی مکاریاں دکھا رہا تھا، اللہ اپنی پوشیدہ تدبیریں کررہا تھا اور اللہ سے بڑھ کر پوشیدہ تدبیریں کون کرسکتا ہے۔ اسی لیے مکے سے چلتے وقت اللہ کے نمائندے نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ میں اپنی قتل گاہ کی طرف جارہا ہوں۔ صرف وہی شخص میرے ساتھ چلے جو میری طرح اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لیے تیار ہو۔

سید الشہداء علیہ السلام کے یہ الفاظ یزیدی منصوبہ سازوں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا جو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ امام معصوم حسینؑ ابن علیؑ کو دھوکا دے سکتے ہیں۔

ابراهیمؑ کربلا

یہ پرندے ساری رات اس میدان کے چاروں طرف پرواز کرتے رہتے اور پو پھٹنے سے پہلے کہیں غائب ہوجاتے۔ کبھی رات کے پچھلے پہر سارا میدان ایسی خوشبوؤں سے مہکنے لگتا کہ ایسی خوشبوئیں قبیلے والوں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھیں۔

—*****—

وہ عجیب ہولناک علاقہ تھا۔ رات تو کیا دن کے وقت بھی اس علاقے سے گزرتے ہوئے خوف آتا تھا۔ اس علاقے کے قریب ہی ایک قبیلہ آباد تھا۔ اس قبیلے کے لوگ بھی دریا کے قریبی علاقے کے قریب مجبوراً ہی جاتے تھے۔ جانے کیا بات تھی کہ اس علاقے میں جاتے ہی دل ڈوبنے لگتا۔ سانس رکنے لگتی اور راستے سے گزرنے والے قافلے اپنی سواریوں کو تیز تیز دوڑا کر یہاں سے جلد از جلد دور نکل جایا کرتے۔

اس علاقے کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ باتیں قبیلے والوں کے بزرگوں نے انہیں بتائی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ علاقہ اللہ کے نبیوں، پیغمبروں اور ان کے سچے جانشینوں کے لیے آزمائش و مصیبت کی جگہ ہے۔ یہاں آباد قبیلہ جس کا نام بنی اسد تھا، دشتِ نینوا میں دریائے فرات کے قریب برسوں سے آباد تھا۔ رات کی تاریکی میں یہ لوگ گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ شام ہوتے ہی کھانا کھا کر سو رہتے اور فجر کے وقت بھی

روشنی پھیل جانے سے پہلے خیموں سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔
گزشتہ کئی دنوں سے انہوں نے دریائے فرات کے قریب نشیبوں اور ٹیلوں میں عجیب وغریب چیزیں دیکھی تھیں۔ اس علاقے میں کبھی رات کے وقت آسمان سے سفید پرندے نیچے اُتر آتے اور نشیبوں اور ٹیلوں کے اوپر پرواز کرنے لگتے۔ اس وقت ان پرندوں کے منہ سے ایسی دردناک آوازیں نکلتیں کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ یہ پرندے ساری رات اس میدان کے چاروں طرف پرواز کرتے رہتے اور پو پھٹنے سے پہلے کہیں غائب ہوجاتے۔ کبھی رات کے پچھلے پہر آسمان سے سفید روشنی کی جھالریں سی زمین پر آ کر بچھنے لگتیں اور سارا میدان ایسی خوشبوؤں سے مہکنے لگتا کہ ایسی خوشبوئیں قبیلے والوں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھیں۔
ایک رات جب قبیلے کے لوگ محرم کا چاند دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہی انہیں ٹیلوں اور نشیبوں کے درمیان کسی غم زدہ عورت کے بین کرنے کی ایسی دردناک آوازیں سنائی دیں کہ ان کے دل ڈوبنے لگے۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک نشیب کے اندر سے مٹی اور گرد وغبار اُڑ رہا تھا۔ ایسا لگا جیسے کوئی نادیدہ ہستی اس نشیب کو صاف کررہی ہو۔ قبیلے والوں کے دلوں میں دُکھ کے بادل چھا گئے۔ وہ اپنے خیموں میں جا چھپے مگر یہ آہیں اور سسکیاں انہیں ساری رات سنائی دیتی رہیں۔ اس علاقے کا نام کربلا تھا اور یہ عراق کے شہر کوفے کے باہر صحرائے نینوا میں نہر فرات کے قریب واقع تھا۔

☆☆☆

نواسۂ رسولؐ کا قافلہ شہادت صحرا میں سفر کرتے ہوئے اسی علاقے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ صدیوں سے ویران علاقہ اب قیامت تک کے لیے آباد ہونے والا تھا۔ شہر مکہ کے قریب وسیع وعریض صحرا کو اللہ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑی قربانیوں کے بعد آباد کیا تھا۔ دشتِ نینوا کے اس ویران صحرا کو ابراہیمؑ کی نسل سے پیدا ہونے والا اللہ کا ایک ولی حسینؑ ابن علیؑ آباد کرنے والا تھا۔ ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی قربانیاں

صدیوں بعد کربلا کے میدان میں ذبحِ عظیم کی اصل شکل میں رونما ہونے والی تھیں۔ اللہ کی وحدانیت کی اس قربان گاہ میں بھیڑوں اور دنبوں کی نہیں جیتے جاگتے نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں، اپنی آنکھ کے تاروں، اپنے پیاروں کی قربانیاں پیش ہونا تھیں۔ ابراہیمِ کربلا اپنی ان قربانیوں کو ساتھ لیے دشتِ نینوا کی جانب تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

ساری رات سفر کرتے ہوئے گزری تھی۔ صحرائی علاقوں میں رات کا وقت سفر کرنے کے لیے زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ دن کی گرمی اور گرد وغبار کے مرغولوں کی وجہ سے صحرا میں سفر کرنے والے قافلے دن میں آرام کرتے ہیں اور رات کو اپنے سفر کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

مشرقی اُفق پر سفیدی کی لکیر نمایاں ہورہی تھی۔ آسمان کے مشرقی کنارے روشن ہونے لگے تھے۔ قافلے والوں نے نمازِ فجر نواسۂ رسولؐ کے ساتھ ادا کی۔ نماز پڑھنے کے بعد امام حسین علیہ السلام نے سفر جاری رکھنے کا حکم دیا۔ آپ چاہتے تھے کہ صحرا میں گرمی کی شدت بڑھنے سے پہلے پہلے جتنا سفر ممکن ہو وہ طے کرلیا جائے۔

حر ابن یزید ریاحی کا فوجی دستہ ساتھ ساتھ سفر کررہا تھا۔ اسے کوفے سے نواسۂ رسولؐ کا راستہ روکنے یا انہیں گرفتار کرکے کوفے میں لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ حر ابن یزید ریاحی نواسۂ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن گورنر کوفہ کے احکامات ماننے پر مجبور تھا۔

دشتِ نینوا کا علاقہ شروع ہوا ہی تھا کہ دور سے ایک اونٹنی سوار کوفے کی جانب سے اس طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ سوار حر ابن یزید کے فوجی دستے کے قریب جاکر ٹھہرا۔ اس نے حر اور اس کے ساتھیوں کو سلام کیا اور اپنی عبا کی جیب سے ایک خط نکال کر حر کی طرف بڑھایا۔ یہ خط کوفے کے گورنر ابن زیاد نے لکھا تھا۔ اس نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

"جب میرا یہ خط تمہیں ملے تو حسینؑ کے تمام راستے بند کردینا اور انہیں کسی ایسی جگہ اُترنے پر مجبور کردینا جہاں انہیں پانی نہ مل سکے۔ میں نے اپنے قاصد کو حکم دیا ہے کہ یہ

اس وقت تک تمہارے ساتھ رہے جب تک تم میرے احکامات پر عمل درآمد نہیں کر لیتے۔"

حر ابن یزید اس خط کو پڑھتا جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اس کا فوجی دستہ پیاس کی شدت سے موت کے منہ میں جانے والا تھا اور علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے حسینؑ نے اپنے پانی کے مشکیزوں سے ان ہزاروں جاں بلب انسانوں اور سواری کے جانوروں کو دوبارہ زندہ کیا تھا۔ اب کوفے کا گورنر اسے حکم دے رہا تھا کہ نبی کے نواسے حسینؑ کو ایسی جگہ محاصرے میں لے لینا جہاں اُنھیں پینے کو پانی نہ ملے۔ حر نے قافلہ حسینی میں شامل عورتوں اور بچوں کے عماریوں پر نظر ڈالی اور سر جھکا کر نواسۂ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے ابن زیادہ کا خط امام علیہ السلام کو پڑھ کر سنایا اور مشورہ طلب نظروں سے امام حسینؑ کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں غاضریہ نہیں تو شفیہ میں اترنے دو۔" امام حسین علیہ السلام نے صلح جوئی کا راستہ اختیار کیا۔ غاضریہ اور شفیہ پر پانی کے کنویں موجود تھے۔

"فرزند رسولؐ ایسا ممکن نہیں ہے۔ ابن زیاد کے کئی جاسوس میری ایک ایک بات کی نگرانی کر رہے ہیں۔" حر ابن یزید نے عرض کی۔

یہ سن کر اصحاب حسینؑ غصے میں آ گئے۔ زہیرؓ ابن قین آگے بڑھے۔ "فرزندِ رسولؐ! ان یزیدیوں سے اسی جگہ نمٹ لیا جائے تو بہتر ہے۔ اس وقت ان سے جنگ کرنا اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دینا مشکل نہیں ہے۔ بعد میں زیادہ فوج آ جائے گی تو ہم گھیرے میں آ جائیں گے۔"

زہیرؓ ابن قین ایک آزمودہ کار فوجی کے طرح مشورہ دے رہے تھے لیکن حسین علیہ السلام کو بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا تھا۔ اسی لیے آپ نے کہا۔ "زہیر! اللہ تمہیں جزائے خیر عطا کرے لیکن میں اپنی طرف سے جنگ کا آغاز نہیں کروں گا۔"

"فرزند رسولؐ! قریب ہی ایک علاقہ ہے اس کے تین طرف سے دریائے فرات گھومتی ہوئی گزرتی ہے۔ وہاں ایک بڑا ٹیلا بھی ہے۔ جنگ کی صورت میں ہم اس ٹیلے

سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' زہیر ابن قین نے عرض کی:

''اس جگہ کا نام کیا ہے؟'' حسین علیہ السلام نے دریافت کیا۔

''اسے عقر کہتے ہیں۔'' زہیر نے بتایا۔

''عقر (جہنم) سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں'' امام حسین علیہ السلام نے فرمایا اور گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے حر سے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے ذرا آگے بڑھنا چاہیے۔''

سارا قافلہ آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑا ہی سفر طے ہوا تھا کہ امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ امام علیہ السلام نے کئی مرتبہ اسے آگے بڑھانا چاہا مگر گھوڑا آگے نہیں بڑھا۔ سامنے ذرا فاصلے پر ایک آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔ امام علیہ السلام گھوڑے پر سوار تھے کہ آبادی کی جانب سے کئی مرد اور بچے دوڑتے ہوئے قافلے کے قریب آگئے۔ ان لوگوں کا تعلق قبیلہ بنی اسد سے تھا۔ جب یہ لوگ قریب آئے تو امام عالی مقام نے ان سے پوچھا۔ ''اس علاقے کا کیا نام ہے؟''

ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر عرض کی: ''اسے نینوا کہتے ہیں۔''

''اس کا کوئی اور نام بھی ہے؟'' امام علیہ السلام نے سوال کیا۔

''اسے غاضریہ بھی کہتے ہیں۔'' ایک نوجوان نے بتایا۔

''اسے شطِ فرات بھی کہا جاتا ہے۔'' ایک اور شخص نے بولا۔

''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی نام ہے اس جگہ کا؟'' امامؑ نے سوال کیا۔

''اسے کربلا بھی کہتے ہیں۔''

کربلا... کرب و بلا...'' امام حسین علیہ السلام کی آواز میں عجب طرح کا درد بھی تھا اور عجب طرح کا سکون بھی۔ ''تھوڑی سی خاک اٹھا کر ہمیں دو۔'' امام علیہ السلام نے بنی اسد کے ایک نوجوان سے کہا۔

اس نے ایک مٹھی خاک اُٹھائی اور امام حسین علیہ السلام کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ امام علیہ السلام نے دوسرا ہاتھ اپنی جیب میں ڈالا۔ جب یہ ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں بھی

مٹی تھی۔ بالکل اسی طرح کی مٹی جیسی آپ کے دوسرے ہاتھ میں تھی۔ آپ نے دونوں ہاتھوں میں موجود مٹی کو سونگھا اور دونوں ہاتھوں کی مٹی زمین پر گرادی۔ آپ کے چہرہ مبارک پر بلا کا سکون اور اطمینان نظر آ رہا تھا۔

آپ نے اپنے بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں، بھانجوں اور اپنے جانثار اصحاب کی جانب دیکھا اور فرمایا۔ ''یہی کربلا کی سرزمین ہے۔ یہاں کی خاک جبرائیلؑ میرے نانا رسول اللہؐ کے لیے لے کر آئے تھے اور کہا تھا کہ یہ خاک قبرِ حسینؑ کی خاک ہے۔ آپ کا نواسہ حسینؑ اسی سر زمین پر بھوکا پیاسا قتل کیا جائے گا۔ یہ فرما کر آپؑ نے پورے قافلے پر نظر ڈالی اور فرمایا:

اترو مسافرو! کہ سفر ہوچکا تمام
کوچ اب نہ ہوگا حشر تلک ہے یہی مقام
مقتل یہی زمیں ہے، یہی مشہدِ امام
اونٹوں سے بار اتار کے برپا کرو خیام
بستر لگاؤ شوق سے اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آب بقا یاں کی خاک پر

مثلِ زمینِ خلد مصفّا ہے یہ زمیں
ساتوں فلک سے اوج میں بالا ہے یہ زمیں
روئے زمیں پہ عرشِ معلیٰ ہے یہ زمیں
فردوس کا کھنچا ہوا نقشہ ہے یہ زمیں
اس کے مکیں نہ ہوں گے پراگندہ نشر میں
بے سر اسی زمین سے اٹھیں گے حشر میں

خاندانِ رسالتؐ کے نوجوانوں اور اصحابِ حسینؑ کے چہروں پر جوش و جذبے کی سرخی دوڑنے لگی۔ باربرداری کے اونٹ بٹھائے جانے لگے۔ گھڑسوار گھوڑوں سے کود پڑے اور خیمے نصیب کرنے میں ملازمین کا ہاتھ بٹانے لگے۔ اس دن محرم الحرام کی دوسری

تاریخ تھی۔

حر ابن یزید کا فوجی دستہ بھی ذرا فاصلے پر خیمے گاڑنے میں مصروف ہوگیا۔ اسی دن حر نے کوفے کے گورنر کو خط لکھا کہ حسینؑ ابن علیؑ کربلا میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے حضرت امام حسین علیہ السلام نے کوفے کے ان افراد کے نام ایک تفصیلی خط تحریر فرمایا جن کے بارے میں یقین تھا کہ وہ حکومت کے پروپیگنڈے اور ظلم وستم سے ابھی تک محفوظ ہوں گے آپ نے لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط حسین ابن علی کی جانب سے سلیمان بن صرد، مسیّب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، عبداللہ بن دال اور مومنین کی ایک جماعت کے نام ہے۔

تم لوگ جانتے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو شخص ظالم حکمران کو دیکھے کہ وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزن کو حرام قرار دے رہا ہو اور خدا کے بندوں پر ظلم کر رہا ہو اور وہ شخص خاموش رہے تو اللہ اس کے لیے وہی عذاب مقرر کرے گا جو ظالم بادشاہ کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ بنی اُمیہ شیطان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خدا کی اطاعت کرنے کے بجائے اللہ سے بغاوت کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اب تک کی صورت حال اور مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں تحریر فرمایا اور کوفے کے عام مسلمانوں کو مخاطب کیا۔

"تمہارے خط مجھے ملتے رہے، تمہارے قاصد بھی مجھ سے ملے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ تم نے میری بیعت کر لی ہے۔ اب تم مجھے میدانِ جنگ میں تنہا نہیں چھوڑو گے، مجھے دشمن کے حوالے نہیں کرو

گے۔ اب اگر تم اپنے وعدوں اور میری بیعت پر قائم ہو تو بلا شک صراطِ مستقیم یہی ہے۔ میں تمہارے ساتھ اور میرا خاندان تمہارے خاندان کا شریک حال ہے۔ اس لیے کہ میں تمہارا امام و رہبر ہوں۔ اور اگر تم نے اپنا عہد توڑ دیا۔ میری بیعت سے نکل گئے تو خدا کی قسم مجھے ہرگز کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ (تمہاری اکثریت) نے میرے والد علیؑ ابن ابی طالبؑ، میرے بڑے بھائی حسنؑ ابن علیؑ اور میرے چچا زاد بھائی مسلمؑ بن عقیل کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔

جو شخص تمہارے فریب میں آئے وہ نا تجربہ کار ہی ہو سکتا ہے۔ وعدے بھولنے اور عہد توڑنے والے کو بہر حال اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ میرا مالک اللہ جل شانہ مجھے بہت جلد تم سے بے نیاز کر دے گا۔"

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

امام عالی مقامؑ نے اپنے دستخط کر کے اس خط کو تہہ کیا اور اپنے ایک جانثار ساتھی قیس ابن مسہر صیداوی کے سپرد کیا۔ "یہ خط کوفے کے مسلمانوں تک احتیاط اور ذمے داری کے ساتھ پہنچانا تمہاری ذمے داری ہے۔" امام حسین علیہ السلام نے قیس کو حکم دیا۔

"جی آقا! میری جان بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔" قیس ابن مسہر نے احترام کے ساتھ کھڑے ہو کر عرض کی۔

قیس ابن مسہر نے اس خط کو عبا میں چھپایا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔ ان کا رخ کوفے کی جانب تھا۔

☆☆☆☆☆

خطیبِؑ کربلا

رات بھر کے حبس کے بعد صبح ہوتے ہوتے ذرا دیر کو ٹھنڈی ہوا چلی لیکن جیسے ہی سورج کا سرخ تھال صحرائی ٹیلوں کے عقب سے اوپر اٹھا، صبح کی ٹھنڈی ہوا دھیرے دھیرے صحرائی لُو کے گرم جھونکوں میں تبدیل ہونے لگی اور دشت نینوا کے نشیب و فراز تنددر کی طرح دہکنے لگے۔

—*****—

خیمہ حسینی میں تو رات آئی ہی نہیں تھی۔ بوڑھے، جوان اور کمسن بچے شوق شہادت میں ساری رات جاگتے رہے تھے۔ انہوں نے ساری رات اپنے مالک اللہ رب العالمین کی عبادت اور آنے والے دن کی تیاریوں میں گزاردی تھی۔ چھوٹے بچے تین دن کی بھوک پیاس سے بے حال تھے اسی لیے نہ یہ بچے سو سکتے تھے نہ ان کی ماں، بہنوں کو نیند آسکتی تھی۔

ظلم کا اندھیرا خورشید امامت کی روشنی بجھانے کو آگے بڑھنے لگا تھا۔ ظالم درندے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے۔ صبح کی ہلکی دھوپ تلواروں کی چمک کو نمایاں کر رہی تھی، نیزے اچھل رہے تھے، تیر کمانوں میں جڑ چکے تھے۔ سرکش گھڑسوار خیمہ حسینی کو روند ڈالنے کے لیے اپنے اپنے گھوڑوں کی لگاموں کو بار بار کھینچ رہے تھے اور گھوڑے بار بار ہنہناتے ہوئے اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو رہے تھے۔

لشکر یزیدی میں باقاعدہ فوج اور مسلح افراد کے جتھوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کی

بھی بڑی تعداد موجود تھی جو فن سپہ گری کا تجربہ نہیں رکھتے تھے لیکن انعام و اکرام اور دشمن کے مال و اسباب کو لوٹنے کے لالچ میں باقاعدہ فوج کے ساتھ شامل ہو کر یہاں آئے تھے۔ ان میں کوئی عیسائی، یہودی اور کافر نہیں تھا۔ یہ سب ''مسلمان'' تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھتے تھے اور دشتِ کربلا میں اسی محمدؐ کے نواسے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے آ کر جمع ہوئے تھے۔

مکے سے نکلنے کے بعد پہلی بار امام حسینؑ کا سامنا ذوحسم نامی منزل پر یزیدی فوج کے ایک دستے سے ہوا تھا۔ اس فوجی دستے کا سردار حر ابن یزید ریاحی تھا۔ ہزار فوجیوں کا یہ دستہ محرم کی دو تاریخ کو امام حسینؑ کے قافلے کے ساتھ کربلا پہنچا تھا۔

اسی دن سے شب عاشور تک امام عالی مقامؑ یزیدی فوجیوں کو بار بار نصیحت کر چکے تھے۔ انہیں بار بار سمجھایا جا چکا تھا۔ ہر موقع پر گمراہی سے بچنے، راہ حق اختیار کرنے اور خون ناحق بہانے سے روکنے کے لیے امام عالی مقامؑ انہیں اللہ سے ڈرانے، اپنی شناخت کرانے اور انھیں بے خبری و گمراہی سے نکالنے کی ہر کوشش کر چکے تھے لیکن یزیدی فوج کے ارادوں، رویّوں اور گستاخیوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

نواسۂ رسولؐ کو اپنے ناناؐ کی امت پر ترس آ رہا تھا۔ ان کے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس قدر مشکلات برداشت کر کے ان بت پرستوں کو جہنم کا ایدھن بننے سے بچایا تھا لیکن منافقین اسلام نے دنیا پرستی کی خاطر ان مسلمانوں کو دوبارہ بت پرستی کی لعنت میں مبتلا کر دیا تھا۔ کعبے کے سارے بت گرائے جا چکے تھے لیکن اب نئے زمانے کے لیے شیطان نے چلتے پھرتے انسانی بتوں کو انسانی معاشروں پر مسلط کر دیا تھا۔

امام حسینؑ اپنے نانا کی امت کو نئے دور کی اس نئی بت پرستی سے نجات دلانے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ نواسۂ رسول انہیں جہنم سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوجوں کی کثرت، قتل ہو جانے کا خوف، تین دن کی بھوک پیاس، اپنے پیاروں کی تکلیفیں، اپنی آنکھ کے تاروں کے مصائب امام عالی مقامؑ کے عزم و ارادے میں ذرا سی بھی رکاوٹ نہیں ڈال

سکے تھے۔ آپ تمام ظلم برداشت کرنے کے باوجود ان گمراہوں کو اللہ کی یاد دلا رہے تھے انہیں ایک اللہ کی عبادت کا درس دے رہے تھے اور کلمہ "لا الہ الا اللہ" کی بنیادوں کو نئے سرے سے استوار کر رہے تھے۔

اس مقصد کے حصول کی راہ میں مایوسی کہاں آپ کے قریب آ سکتی تھی، بے تابی و بے قراری کس طرح آپ پر طاری ہوسکتی تھی، خوف انہیں کس طرح مغلوب کرسکتا تھا، شیطان کب آپ کے ہوش وحواس میں انتشار اور پائے استقامت میں لرزش پیدا کرسکتا تھا کہ آپ حسینؑ تھے۔ نواسۂ رسولؐ، جگر گوشہ بتولؑ آپ کی رگوں میں علیؑ ابن ابی طالبؑ جیسے بہادر کا لہو دوڑ رہا تھا۔

اسی لیے جیسے جیسے مصائب بڑھ رہے تھے آپ کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے خنجر کی دھار قریب آ رہی تھی۔ آپ کا چہرہ مبارک نور شہادت سے روشن و منور ہوتا جا رہا تھا۔

یزیدی سردار آپ پر طنز کے تیر چلاتے تو نواسۂ رسولؐ کی سوکھی زبان سے حمد و مناجات کے دریا بہنے لگتے اور آپ اللہ کے نام کو مٹانے کی کوشش کرنے والوں کے سامنے اپنے مالک اللہ رب کریم کی نعمتوں کا ذکر اس طرح کرتے کہ دشمنانِ خدا کی ساری دلیلیں ٹوٹ جاتیں اور حق پرستوں کے دل نور ہدایت سے منور ہوجاتے۔

خطرات ہر لمحے بڑھتے جا رہے تھے، مشکلات و مصائب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جس قدر مشکلات بڑھتیں آپ اسی قدر زیادہ شکر ادا کرتے اور جب نواسۂ رسولؐ ہر لمحے بڑھتی ہوئی مصیبتوں میں شکرِ الٰہی بجالاتے تو فرشتے آپ کے گرد طواف کرنے لگتے، حوریں آہ و بکا کرتیں، جنت نواسۂ رسولؐ کے قدموں کے نیچے جگہ پانے کو بے تاب ہوجاتی اور فرشتے ایک دوسرے سے کہتے۔ "دیکھو! اللہ کے اس صابر شاکر بندے کو، جو ہزاروں دشمنوں میں اپنے پروردگار کے وجود کی گواہی بنا تنہا کھڑا ہے۔ یہی وہ نور محمدؐ ہے جو آدمؑ کی پیشانی میں جلوہ گر تھا اور ہم آدمؑ کے سامنے سجدے میں گر گئے تھے۔ یہ نور محمدؐ آج حسینؑ کی صورت دشتِ کربلا میں گمراہوں کو اپنے نور ہدایت سے صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہا

ہے۔فرشتے آج سمجھ پائے تھے اللہ نے ان سے آدمؑ کو سجدہ کیوں کروایا تھا!

☆☆☆

خیمہ حسینی کے باہر فجر کی نماز اس وقت پڑھی گئی کہ ابھی رات کی مشعلیں روشن تھیں۔ شہیدوں کا قافلہ اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔نماز تمام ہوئی تو رات کے دم توڑتے نیم تاریک اندھیرے میں مشعلوں کی روشنیاں تھرتھرانے لگی تھیں۔ امام حسینؑ نے دستِ دعا آسمان کی طرف بلند کیے اور انکساری و شکر گزاری کے ساتھ بارگاہ رب العالمین میں عرض کی۔

> ''اے اللہ! مشکلات کے وقت بس تو ہی میرا سہارا اور سخت آزمائشوں کے دوران تو ہی میری امید ہے۔ جو کچھ (مصیبتیں) مجھ پر نازل ہوئیں اس میں تو ہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔
>
> پالنے والے! کتنے غم ہیں جن سے دل ٹوٹ گئے اور ان سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا۔ بس میں صرف تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ تجھ سے امید رکھنے سے دوسروں سے بے نیازی حاصل ہوتی ہے۔
>
> تو اے میرے پالنے والے! بند دروازوں کو کھول دے اور امید کی کرن دکھا دے کہ تو ہی ہر نعمت کا مالک اور تمام تعریفیں تجھی کو سزاوار ہیں اور تو ہی میری آرزوؤں کا مرکز ہے''

امام عالی مقامؑ یہ دعا مانگ رہے تھے اور آپؑ کے عقب میں بیٹھے ہوئے بہادروں کے رخسار آنسوؤں سے تر ہوتے جارہے تھے۔سجدہ شکر کے بعد امام حسینؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے اصحاب کے سامنے مختصر سی تقریر کی اور فرمایا۔

> ''اللہ تعالیٰ نے مجھے اور تمہیں شہادت پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔صبر اختیار کرو اور اللہ کی خوشنودی و مغفرت کے لیے آگے بڑھو!''

یہ سن کر اصحاب حسینؑ کے چہرے شوق شہادت سے سرخ گلاب کی طرح کھل اٹھے۔

☆☆☆

صبح کی روشنی پھیلی تو امام عالی مقامؑ نے فوجی حکمت عملی کے مطابق اپنے مختصر سے ساتھیوں کو چھوٹی سی فوج کی طرح منظّم کیا۔ میدان کے دائیں بائیں حصوں پر رہنے والے اپنے جانثاروں کا سردار زہیرؑ ابن قین اور حبیبؑ ابن مظاہر کو مقرر کیا۔ فوج کا علم اپنے بھائی عباسؑ ابن علیؑ جیسے بہادر کو عطا فرمایا اور کچھ اصحاب کو حکم دیا کہ رات کے وقت اہل بیتؑ کے خیموں کے پیچھے جو خندق کھودی گئی تھی اس میں لکڑیاں ڈال کر آگ روشن کردی جائے تا کہ دشمن اہل حرم کے خیموں پر پیچھے سے حملہ آور نہ ہوسکیں۔

خندق میں آگ روشن کرنے کے بعد جب تمام اصحاب ایک جگہ آ گئے تو یہ مختصر سی فوج امام عالی مقامؑ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہوگئی۔

یزیدی فوجی دستے چاہتے تھے کہ ایک بڑی یلغار کرکے امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کو قتل کردیں اور خیمہ حسینیؑ کو روند ڈالیں۔ اس منصوبے کے تحت پہلے شمر ذی الجوشن اپنے گھوڑے کو کداتا ہوا خیمہ حسینی کے عقب سے گزرا۔ وہ موقع کا معائنہ کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے خیموں کے پیچھے آگ کی خندق کو مہکتے ہوئے دیکھا تو جھنجھلا کر رہ گیا۔ اس نے زور سے چیخ کر مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''حسینؑ! تم نے قیامت آنے سے پہلے ہی اپنے لیے آتش جہنم کا انتظام کرلیا؟''

نواسۂ رسولؐ کی شان میں یہ گستاخی اس نے اشتعال دلانے کے لیے کی تھی تا کہ امام حسینؑ کا کوئی ساتھی اس پر حملہ آور ہوجائے اور جنگ شروع کرنے کا الزام قافلہ حسینی پر لگایا جاسکے۔ اس اشتعال انگیزی کے جواب میں امام حسینؑ نے حقارت کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ ''او بکری چرانے والی عورت کے بیٹے! تو واقعی جہنم میں داخل کیے جانے اور آگ میں جلنے کے لائق ہے''۔

شمر کی ماں کو ''بکری چرانے والی عورت''۔ کہہ کر امامؑ نے شمر کو ایک ایسی حقیقت یاد دلا دی تھی جس سے وہ خود بھی منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ اس کی ماں بکریاں چراتے چراتے صحرا میں راستہ بھٹک گئی تھی۔ پیاس سے مرنے کے قریب تھی کہ اسے ایک چرواہا نظر آیا۔ اس

نے اس چرواہے سے پانی مانگا۔ پانی کے بدلے اس چرواہے نے جو کچھ مانگا شمر ذی الجوشن اسی کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔

بزرگ صحابی رسول حضرت مسلم ابن عوسجہ شمر ملعون کا جملہ سن کر غصے سے بے قابو ہو گئے۔ آپ ایک ماہر تیر انداز تھے۔ آپ نے اپنا تیر کمان پر رکھا لیکن پھر رک گئے اور امام سے عرض کی۔ ''آقا! آپ اجازت دیں تو ظالموں کے اس سرغنے کا کام تمام کر دوں؟''

امامؑ نے ان کی کمان پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں! جنگ کا آغاز اپنی طرف سے کرنا مجھے پسند نہیں۔''

اس کے بعد حضرت امام حسینؑ نے اپنا گھوڑا طلب کیا۔ آپ کے فرزند شبیہ پیغمبر حضرت علی اکبرؑ نے گھوڑے کی باگیں تھامیں، حبیبؑ ابن مظاہر نے رکابوں کو پکڑا اور امام عالی مقامؑ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

سامنے قاتلوں کے جھتے حدِ نظر سے تلواریں سونتے کھڑے تھے لیکن امام عالی مقام پورے اعتماد اور سکون کے ساتھ ان کی طرف بڑھے اور ان کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ آپؑ نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور فرمایا۔ ''لوگو! میری بات سنو!'' آپ کے لہجے میں نہ کوئی پریشانی تھی نہ گھبراہٹ۔ اس کے بجائے آپ کا لہجہ اس قدر پرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا جیسے آپ اپنے جان کے دشمنوں سے نہیں اپنے چاہنے والوں سے مخاطب ہوں۔

یزیدی لشکر پر ایک لمحے کو سناٹا سا چھا گیا۔ اس سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے امام عالی مقامؑ نے یزیدی فوجیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

> ''دیکھو! جنگ کرنے میں ابھی جلد بازی سے کام نہ لو جب تک کہ میں تمہیں اس چیز کی نصیحت نہ کر دوں جس کی نصیحت کرنا میرا فرض ہے۔ میں ساری حقیقت تمہارے سامنے بیان کیے دیتا ہوں۔ میری بات سن کر اگر تم انصاف سے کام لو گے تو تمہاری قسمت جاگ جائے گی اور اگر میری بات کو قبول نہیں کرو گے تو یقین کر لو کہ تم حق و

انصاف سے کنارہ کشی کروگے۔ اس کے بعد تم ہم سے جنگ
کروگے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ میرا آقا و مولا ہے۔ وہ اللہ جس
نے قرآن کریم کو نازل کیا....!!

آپؑ کی آواز ہوا کے ساتھ سفر کرتی ہوئی اہل حرم کے خیموں تک پہنچی تو سننے والی خواتین اور بچوں کا دل بھر آیا۔ خیموں سے رونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

اپنے اہل حرم کے رونے کی آواز سن کر آپ نے تقریر روک دی اور اپنے بیٹے علی اکبرؑ اور اپنے بھائی عباسؑ سے کہا۔ ''تم خیمے میں جا کر گھر والوں کو تسلی دو۔ خواتین سے کہو کہ خاموش ہو جائیں۔ ابھی انہیں رونے کا بہت موقع ملے گا''۔

حضرت علی اکبرؑ اور حضرت عباسؑ تیزی سے خیموں کی طرف دوڑے۔ ذرا دیر بعد آہ و فغاں کا شور تھم گیا۔ رونے کی آوازیں بند ہوئیں تو آپ دوبارہ لشکر یزید کی جانب متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاؑ، مرسلینؑ اور فرشتوں پر درود بھیجا اور اپنی تقریر دوبارہ شروع کی۔

''لوگو! مجھے پہچانتے ہو؟ دیکھو میں کون ہوں۔ ہوش میں آؤ اور غور
کرو کہ کیا مجھے قتل کرنا اور میری حرمت کو پامال کرنا تمہارے لیے کسی
بھی طرح جائز ہے؟

کیا میں تمہارے نبیؐ کی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا بیٹا اور وصی رسولؐ علیؑ ابن
ابی طالبؑ کا فرزند نہیں ہوں؟

کیا رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان
لانے والے اور سب سے پہلے ان کی نبوت کی تصدیق کرنے والے
علیؑ بن ابی طالبؑ میرے باپ نہیں ہیں؟

کیا سید الشہداء حمزہؑ ابن عبد المطلبؑ میرے والد کے چچا نہیں تھے؟

کیا جعفر طیارؑ جو جنت میں فرشتوں کے ساتھ پرواز کرتے ہیں

میرے چچا نہیں؟

کیا تم نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہم دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔

دیکھو! اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو ابھی تمہارے درمیان ایسے اصحاب رسولؐ موجود ہیں کہ اگر تم ان سے معلوم کرو تو وہ تمہیں بتلا دیں گے۔ وہ سچ بولنے اور حق بات کہنے میں مشہور ہیں۔ وہ میرے بات کی تصدیق کریں گے۔

جابر ابن عبداللہ انصاریؓ، ابوسعید خدریؓ، سہل بن سعد ساعدیؓ، زید بن ارقمؓ ان میں سے کسی سے بھی جا کر پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے رسول اللہؐ سے میرے بارے میں کیا سنا ہے۔ اس طرح میری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔

کیا یہ گواہیاں تمہیں میرا خون بہانے سے باز رکھنے کو کافی نہیں ہوں گی؟"

ہر طرف سناٹا تھا۔ بس گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں اور زرہ بکتروں کی جھنجناہٹ اس سناٹے کو توڑ رہی تھی۔ نیزوں کے پھل مشرق سے اوپر اٹھتے ہوئے سورج کی روشنی میں بار بار چمک رہے تھے۔

امام حسینؑ کی آواز سب سن رہے تھے لیکن جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ امام حسینؑ ذرا دیر خاموش رہے تاکہ لشکر یزید سے کوئی جواب آئے لیکن وہاں تو بس سناٹا تھا، موت کا گہرا سناٹا۔

آخر امام عالی مقامؑ گھوڑے کی رکابوں میں پاؤں جما کر بلند ہوئے اور آپ کی آواز میدان کربلا میں دوبارہ گونجی۔

"کیا تمہیں اس بات میں کوئی شک ہے کہ میں فاطمہؑ زہرا بنت

رسول اللہؐ کا بیٹا ہوں۔ خدا کی قسم آج مشرق سے مغرب تک
میرے سوا کوئی (تمہارے) رسولؐ کی بیٹی کا بیٹا نہیں ہے۔"

سر جھکے ہوئے تھے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یزیدی سپاہی خاموشی سے اپنے گھوڑوں کی گردنیں تھپتھپا رہے تھے، اپنے نیزوں کو بے تابی سے بار بار زمین میں گاڑ گاڑ کر نکال رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ تو بس اپنے سردار عمر ابن سعد کے اشارے کے منتظر تھے۔ کہ وہ حکم دے تو وہ آندھی طوفان کی طرح قافلہ حسینی پر حملہ آور ہو جائیں۔

امام حسینؑ ان کی بے حسی و بے تابی کو دیکھ رہے تھے لیکن آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ آپ نے ان سے سوال کیا۔" وائے، ہو تم پر.... کیا میں نے تم میں کسی کو قتل کیا ہے؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔

اس کے بعد امام عالی مقامؑ نے نام بہ نام ان لوگوں کو مخاطب کیا جنہوں نے کوفے سے امام حسینؑ کو خط لکھے تھے۔ آپ کی مدد کا وعدہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ اس وقت یہ لوگ یزید کے لشکر میں اگلی صفوں میں ننگی تلواریں تھامے گھوڑوں پر سوار تھے۔ امامؑ نے انہیں غیرت دلائی۔

"اے شبث ابن ربعی!.... اے حجار ابن ابجر!.... اے قیس ابن اشعث!.... اے یزید ابن حارث!.... کیا تم نے اپنے خطوں میں نہیں لکھا تھا کہ میوے پک چکے ہیں، زمین سرسبز ہے۔ اگر آپ آئیں تو ایک لشکر جرار آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟"

امام حسینؑ نے سوال کرتے کرتے قیس ابن اشعث کی طرف دیکھا۔ قیس ابن اشعث، جعدہ بنتِ اشعث کا بھائی تھا جس نے یزید سے شادی کے لالچ میں آ کر امام حسن علیہ السلام کو زہر دیا تھا۔ اس کا دوسرا بھائی محمد ابنِ اشعث اس فوجی دستے کا سردار تھا جس نے کوفے میں حضرت مسلمؑ بن عقیل کو دھوکے سے گرفتار کیا تھا۔

قیس ابنِ اشعث کی نظریں امامؑ سے ملیں تو اسے جواب دینا پڑ گیا۔ اس نے مری

ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بہرحال بہتر یہی ہے کہ آپ امیر المومنین یزید ابن معاویہ کی بیعت کرلیں اس میں آپ کا فائدہ ہی فائدہ ہے''۔

یہ سن کر امام عالی مقامؑ کو جلال گیا۔ دنیا کی غلاظت کھانے والا ایک حقیر کتا امامِ وقتؑ کو فائدے اور نقصان کے بارے میں سمجھا رہا تھا!

امام حسینؑ نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور فرمایا۔

''خدا کی قسم! میں ذلیل و پست لوگوں کی طرح نہ یزید کی بیعت کروں گا اور نہ غلاموں کی طرح مقابلے سے دستبردار ہوں گا۔''

اس کے بعد آپؑ نے کہا۔

''اے خدا کے بندو! میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے پناہ کا طلب گار اور ان سرکشوں سے بیزار ہوں جو روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے''۔

یزیدی حکومت دینِ اسلام کی بنیادوں کو مٹا دینا چاہتی تھی۔ یزید کھلے عام کہتا تھا کہ نہ کوئی وحی نازل ہوئی نہ فرشتے۔ یہ سب بنی ہاشم کا بنایا ہوا کھیل ہے۔ جہنم کی باتیں لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ میں نے تو جنت کی حوروں کے بدلے سارنگی کی لے کو پسند کرلیا ہے۔ یزیدی حکومت اسلامی معاشرے میں انہی گمراہ کن باتوں کو رواج دینا چاہتی تھی۔

اس کے برعکس نواسۂ رسولؐ اپنے خطبات اور گفتگو میں بار بار اللہ کی یاد دلاتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے، جنت و دوزخ اور روزِ قیامت کا بار بار تذکرہ کرتے تاکہ دین اسلام کے خلاف یزیدی سازشوں کا قلع قمع کیا جاسکے۔

امامؑ کے سامنے وہ لوگ کھڑے تھے جو دولت و اقتدار کے بتوں کو پوجتے پوجتے خود بھی ظلم وسفاکی کے بتوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ ان بتوں سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی لیکن امام حسینؑ آج ان کے سامنے حجت تمام کرکے ان کے بہ ظاہر انسانی چہروں اور رویوں کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے تاکہ آنے والے زمانے کے انسان ظلم وسفاکی کے ان مجسموں کو اچھی طرح پہچان سکیں۔

مظلومؑ کربلا

خلیفتہ المسلمین یزید ابن معاویہ کی فوجیں اپنی دانست میں اپنے مقاصد حاصل کرچکی تھیں۔ بدر و احد کے بدلے چکائے جاچکے تھے۔ نواسۂ رسولؐ کو ذبح کردیا گیا تھا اور اب شیطان کے وفادار آگ کی مشعلیں تھامے اپنے رسول محمد مصطفیؐ کے گھر کو آگ لگانے خیمۂ اہل بیتؑ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

—*****—

پھر وہ وقت بھی آیا کہ کوئی باقی نہ رہا۔ حبیبؑ ابنِ مظاہر، مسلمؑ بن عوسجہ، زہیرؑ ابن قین، علی اکبرؑ، قاسمؑ، عونؑ و محمدؑ حتیٰ کہ چھ ماہ کا علی اصغرؑ بھی شہید کردیا گیا۔ اب امام مظلومؑ تنہا کھڑے تھے۔ لباس خون میں بھرا ہوا، عزیزوں اور ساتھیوں کے غم سے نڈھال، تین دن کی بھوک پیاس کے سبب کمزوری اور نقاہت کا غلبہ، خیموں سے اٹھتا ہوا دھواں، آسمان سے آگ برساتا سورج، آگ کی طرح دہکتی ہوئی زمین، عورتوں اور بچوں کی فریادیں، اس وقت امام مظلومؑ نے صدائے استغاثہ بلند کی۔

"ہے کوئی جو حرم رسولؐ سے دشمنوں کو دور کرے؟ کیا کوئی اللہ کو ماننے والا ہے جو ہم پر ہونے والے ظلم کے بارے میں اللہ سے ڈرے؟ ہے کوئی جو ہماری فریاد رسی کرے؟ ہے کوئی جو ہماری مدد

کر کے خدا سے اجر و ثواب کی امید رکھے؟''

صدائے استغاثہ سن کر سیدانیوں میں کہرام برپا ہوگیا۔ عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سن کر حضرت علیؑ ابن الحسینؑ غش سے چونک پڑے اور تلوار پکڑ کر خیمے سے باہر نکلے۔ شدید بخار کے سبب آپ کے پاؤں لرز رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا آرہا تھا لیکن اس کے باوجود آپ میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ جناب زینبؑ و ام کلثومؑ ان کے پیچھے پیچھے دوڑیں۔ ''علیؑ ابن الحسینؑ میرے بھتیجے لوٹ آؤ۔ خدا کے واسطے تم میدان میں نہ جاؤ۔''

امام زین العابدینؑ نے کہا: ''پھوپھی اماں! چھوڑ دیں مجھے۔ اس وقت باباؑ کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔''

اس وقت امام عالی مقامؑ نے انہیں دیکھا اور گھبرا کر پکارے: ''زینب! روک لو اسے! ڈرتا ہوں کہ زمین حجت خدا اور نسل آل محمدؐ سے خالی نہ ہو جائے۔''

آخر جناب زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے بھتیجے کو روکا اور سہارا دے کر واپس خیمے میں لے گئیں۔

☆☆☆

لشکر یزیدی تازہ دم ہو رہا تھا۔ گھوڑوں اور اونٹوں کو سیراب کیا جا رہا تھا۔ تلواروں کی دھاریں تیز کی جا رہی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے نیزوں کو تبدیل کیا جا رہا تھا۔ پانی کے پیالے بھر بھر کر سروں پر ڈالے جا رہے تھے۔

ادھر امامِ مظلومؑ تین دن کی بھوک پیاس سے نڈھال آگ برساتے سورج کے نیچے تنہا کھڑے تھے۔ آپ کے تمام ساتھیوں کی لاشیں ریتیلے میدان میں بے حرکت پڑی تھیں۔ آپ بہ مشکل قدم اٹھاتے، آہستہ آہستہ چلتے شہیدوں کی لاشوں کے قریب آئے اور ایک ایک شہید کا نام لے کر پکارا۔

''اے حبیب ابن مظاہر! اے زہیر ابن قین! اے مسلم ابن عوسجہ!

عباس! علی اکبر! میرے دلیرو میرے بہادرو، میرے جاں نثارو، اٹھو
کہ میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہا ہوں لیکن تم میری بات
نہیں سنتے۔ میں تمہیں بلا رہا ہوں مگر تم نہیں آتے۔ دیکھو یہ آل
رسولؐ کی عورتیں ہیں۔ تمہارے بعد ان کا کوئی مددگار نہیں۔ بہادرو!
اپنی نیند سے اٹھو اور آلِ رسولؐ کو ان سرکشوں کے ظلم سے بچاؤ۔"

امام مظلومؑ کی درد بھری آواز فضا میں گونجی تو شہیدوں کی لاشوں میں حرکت پیدا ہوگئی جیسے وہ آپ کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہوں۔

اس کے بعد آپ نے دشمنوں کی صف بندی کو دیکھا۔ آپ اسی عالم میں ان کے قریب گئے اور انہیں آخری مرتبہ سمجھانا شروع کیا۔ انہیں خدا کی یاد دلائی۔ اس وقت آپ کی داڑھی کے سفید و سیاہ بالوں میں شہیدوں کے خون کی سرخی جھلک رہی تھی۔ کمزوری، نقاہت اور بھوک پیاس کی شدت سے بولنا مشکل ہو رہا تھا اس کے باوجود آپ نے اعجازِ امامت سے ایک ولولہ انگیز خطبہ ارشاد فرمایا۔

"خدا کے بندو! خدا سے خوف کھاؤ اور دنیا سے دامن بچا کر رکھو۔
دیکھو! دنیا اگر کسی کے لیے باقی رہتی اور اگر کسی کو دنیا میں ہمیشہ کی
زندگی ملا کرتی تو انبیاء و مرسلین اس کے زیادہ حق دار تھے لیکن اللہ
نے اس دنیا کو امتحان و آزمائش اور اہل دنیا کو فنا کے لیے خلق کیا
ہے۔ تم دیکھتے ہی ہو کہ یہاں ہر چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ ہر نعمت آخر
کار ختم ہو جاتی ہے اور اس کی خوشیاں رنج و غم میں تبدیل ہوتی رہتی
ہیں۔ دنیا رہنے کی جگہ نہیں یہ آخرت کے لیے سامانِ سفر حاصل
کرنے کا مقام ہے۔ یہاں کی عارضی زندگی کے ذریعے آخرت کی
ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے سامان سفر فراہم کرلو اور بہترین زادِ
راہ تقویٰ ہے۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو کہ کامیاب ہو جاؤ۔"

اس خطبے کے بعد آپؑ نے لشکر یزید کے جتھوں پر نظر دوڑائی لیکن وہاں کوئی آپ کی باتوں کا اثر قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ امام حسینؑ کسی زخمی شیر کی طرح پر وقار انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے خیمے کی طرف بڑھے۔ در خیمہ کا پردہ اٹھا کر آپ نے کہا: ''یا سکینہؑ! یا فاطمہؑ! یا رقیہؑ! یا زینبؑ! یا ام کلثومؑ! سب پر میرا سلام!''

آپ کی آواز سن کر خیمۂ اہل بیتؑ میں کہرام مچ گیا۔ امامؑ نے تمام اہل حرم کو صبر و برداشت کی تلقین کی اور فرمایا۔ ''صبر کا لباس پہن کر مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جان لو کہ خدا تمہارا محافظ و نگہبان ہے تم جو رنج اٹھاؤ گے اللہ اس کے بدلے تمہیں اپنی عظیم نعمتوں اور بے مثال عظمتوں سے سرفراز کرے گا۔ زبان سے شکوہ نہ کرنا اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جو تمہارے مقام سے کمتر ہو۔''

ہر طرف خاک اڑ رہی تھی۔ خیمے کی قناتیں صحرا کی تیز ہوا سے بری طرح لرز رہی تھیں۔ گرمی، حبس، تین دن کی بھوک پیاس اور عزیزوں کی موت کے صدمے نے عورتوں اور بچوں کے چہروں کا رنگ چھین لیا تھا۔ چہروں پر جمی ہوئی گرد اور بہتے ہوئے آنسوؤں نے بچوں کے رخساروں پر لکیریں ڈال دی تھیں۔

جناب زینبؑ و ام کلثومؑ آگے بڑھیں، انہوں نے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور سہارا دے کر ایک جگہ لا کر بٹھایا۔ اسی وقت امام عالی مقامؑ کی لاڈلی بیٹی سکینہؑ آ کر آپ کی گود میں بیٹھ گئی۔ ''بابا! ہمیں یہاں سے نکال کر نانا رسول اللہؐ کے روضے پر پہنچا دیں۔'' سکینہؑ نے روتے روتے کہا۔ چار سال کی معصوم بچی بری طرح گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

امام عالی مقامؑ نے سکینہؑ کے خاک آلود ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بے بسی کے ساتھ فرمایا: ''ہاں بیٹا! اگر پرندہ قطار چھوڑ دیتا تو آرام کر سکتا تھا۔''

امامؑ اور بی بی سکینہؑ کے درمیان گفتگو سن کر عورتوں کا دل بھر آیا۔ زور زور سے بین کرنے لگیں۔ امام حسینؑ نے انہیں تسلی دی۔ ''ام کلثومؑ! میری پیاری بہن! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میرے غم میں ہوش و حواس نہ کھونا۔''

آپ کی لاڈلی بیٹی سکینہؑ نے آپ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر دوبارہ اپنی طرف کرلیا اور رونے لگیں۔

امام علیہ السلام سکینہؑ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ آپ نے سکینہؑ کو پیار کیا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میری جان میری سکینہؑ! میری لاڈلی بیٹی... دیکھو سکینہؑ! مجھے اس طرح نہ تڑپاؤ۔ میری شہادت کے بعد تمہیں بہت رونا پڑے گا۔ میرے جیتے جی اس طرح نہ روؤ۔ میں شہید ہوجاؤں تو میرے سوگ میں بیٹھنا۔''

جناب زینب سلام اللہ علیہا آگے بڑھیں اور سکینہؑ کو باپ کی گود سے اپنی گود میں لے لیا اور انہیں سمجھانے لگیں۔ ''سکینہ! بابا کو جانا ہے، بابا کا راستہ نہ روکو۔ بابا نے اللہ کی راہ میں یہ قربانی پیش نہ کی تو حق و باطل کے درمیان تمیز ختم ہوجائے گی، مسلمان قیامت تک کے لیے گمراہ ہوجائیں گے۔ تمہارے بابا! تمہارے جدؐ کی امت کو راہ دکھانے، انہیں بخشوانے کے لیے جارہے ہیں۔ سکینہ!.... بابا کو رخصت کرو۔'' جناب زینبؑ وام کلثومؑ اپنی بھتیجی کے خاک سے بھرے ہوئے سر کو سہلاتی جارہی تھیں اور اپنے آنسوؤں کو ضبط کرکے انہیں سمجھائے جارہی تھیں۔

امام حسینؑ نے ایک پرانا لباس طلب کیا۔ خیمے کے دوسرے حصے میں جاکر پہلے پرانا لباس پہنا اس کے اوپر اپنا خون آلود لباس زیب تن کیا۔ جناب رسول خداؐ کا عمامہ سر پر باندھا۔ اپنے ناناؐ کی زرہ پہنی، فاتح خیبر علیؑ ابن ابی طالبؑ کی تلوار نیام میں رکھی اور خیمے سے نکل آئے۔ ذوالجناح پر سوار ہوئے۔ سیدھے ہوکر گھوڑے پر بیٹھے اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کی طرح گھوڑا دوڑاتے ہوئے میدان کارزار میں پہنچ گئے۔

☆☆☆

لشکر یزید دوبارہ جنگ کے لیے تیار ہوچکا تھا۔ امامؑ نے حقارت کے ساتھ چوپایوں بلکہ ان سے بھی بدتر انسانوں کے اس ہجوم کو دیکھا اور گرجتی ہوئی آواز میں انہیں مخاطب کیا۔

''میں خاندان ہاشم میں سے پاک ومطہر علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بیٹا

ہوں میرے لیے اتنا فخر ہی کافی ہے کہ میرے جد رسول خداؐ ہیں جو زمین پر چلنے والوں میں سب سے افضل ہیں۔ ہم خلق خدا کے درمیان اللہ تعالیٰ کی روشن شمعیں ہیں۔ میری ماں فاطمہؑ بنت رسول اللہؐ ہیں۔ میرے چچا جعفر طیارؑ ہیں جنہیں خدا نے دو پر عطا کیے ہیں جن سے وہ جنت میں پرواز کرتے ہیں۔

کتاب خدا ہمارے ہی گھر میں نازل ہوئی۔ ہم ہی تمام لوگوں کے لیے خدا کی پناہ ہیں۔ ہم حوض کوثر کے مالک ہیں۔ ہم اپنے دوستوں کو رسول خداؐ کے پیالے سے سیراب کریں گے۔ اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے!

ہمارے شیعہ بہترین پیروکار ہیں اور ہمارے دشمن قیامت کے دن بڑے خسارے میں رہیں گے۔ ذلت قبول کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی مر جائے اور جہنم میں جانے سے بہتر ہے کہ انسان دنیا میں (ظاہری) ذلت کو برداشت کرلے اور سن لو میں حسینؑ ابن علیؑ ہوں میں جیتے جی کبھی خود کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔"

امامؑ خاموش ہوئے ہی تھے کہ فوج یزید کی جانب سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر امام حسینؑ نے ذوالفقار کو نیام سے نکالا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور غضبناک شیر کی طرح دشمنوں پر حملہ کردیا۔ آپ تلوار چلاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: "بھوکے پیاسے کی جنگ دیکھو... جس کا کڑیل جوان بیٹا قتل ہوگیا اس کی جنگ دیکھو..... جس کا بہادر بھائی مارا گیا اس کی جنگ دیکھو...."

ہر طرف تلواریں کوندرہی تھیں، نیزے اڑ رہے تھے، تیر سنسنا رہے تھے۔ پتھروں کی بارش ہورہی تھی لیکن حسین علیہ السلام کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ تیس ہزار فوج بدحواس ہوکر ادھر ادھر بھاگنے لگی۔ حسین ابن علیؑ اپنے والد علیؑ ابن ابی طالبؑ کی طرح دشمنوں کی صفوں کو

تتر بتر کرتے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں غیض و غضب کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ تلوار خون میں بھری ہوئی تھی اور اس کے دستے سے خون کی قطاریں بہہ رہی تھیں اور آپ کے نعروں نے دشمنوں کے ہوش و حواس گم کر دیے تھے۔ آپ تلوار چلاتے اور گرج گرج کر کہتے۔ ''میں دین اسلام کو بچاؤں گا۔ میں اپنے جدؐ کے دین کی حفاظت کروں گا۔ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہوں۔ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہوں۔''

امام حسینؑ کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ یزیدی فوج صحرا میں بکھر کر رہ گئی۔ بہت سے فوجی خوف کے مارے بھاگے تو کوفے کی دیواروں تک پہنچ گئے۔ صحرائی ریت کے بگولوں اور چلچلاتی دھوپ کے درمیان امام حسینؑ ذوالجناح پر سوار اکیلے کھڑے تھے۔ پیاس کی شدت سے زبان کو حرکت دینا مشکل ہو رہا تھا۔ کمزوری اور نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی زین کو تھام رکھا تھا اور جسمانی کمزوری کے سبب سر جھکائے ہوئے گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

اس وقت عمر سعد نے ایک بار پھر فوج منظم کی اور تیر اندازوں سے کہا کہ حسینؑ پر تیروں کی بارش برساؤ۔ پتھر مارنے والوں کو حکم دیا کہ حسین کے قریب نہ جانا دور رہ کر پتھر مارنا شروع کر دو۔ اس حکم کے ساتھ ہی نواسۂ رسولؐ پر تیروں اور پتھروں کا مینہ برسنے لگا۔

اسی دوران ایک نوکیلا پتھر اڑتا ہوا آیا اور حسینِؑ مظلوم کی پیشانی کو لہولہان کر گیا۔ آپؑ نے پیشانی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سامنے سے ایک تیر آیا اور آپ کے سینۂ مبارک میں ترازو ہو گیا۔ اس وقت امام مظلومؑ کے دل سے آہ نکلی۔ آپ نے بے بسی کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

> ''بسم اللہ و باللہ وعلی ملة رسول الله... اے اللہ تو جانتا ہے کہ یہ لوگ کسے قتل کر رہے ہیں۔ تو جانتا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر میرے سوا کوئی فرزند رسولؐ نہیں ہے۔''

یہ کہتے کہتے تیر کو پکڑ کر سینے سے باہر کھینچا۔ تیر باہر نکلا تو زخم سے پرنالے کی طرح

خون بہنے لگا۔ آپ نے اس خون کو اپنے چلو میں لیا اور اسے اپنے چہرے پر مل لیا اور فرمایا۔ ''اب میں اسی عالم میں اپنے جد رسول اللہؐ سے ملاقات کروں گا۔''

اس وقت لشکر یزید نے ہر طرف سے حملہ شروع کر دیا اور امام عالی مقام تیروں، تلواروں، نیزوں اور خنجروں کے واروں سے زخمی ہوتے چلے گئے۔ ذوالجناح کی باگیں ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور آپ ہر طرف سے ہونے والے حملوں کے سبب گھوڑے پر ڈگمگانے لگے۔ آخر کسی ظالم نے آپ کے جسم پر پوری طاقت سے ایک نیزہ مارا اور آپ گھوڑے سے نیچے گر گئے۔

جسم پر ہر طرف نیزوں اور تلواروں کے زخم تھے۔ ہر جگہ تیر پیوست تھے اس لیے زمین پر گرے تو کسی پہلو پر بیٹھنا یا لیٹ جانا ممکن نہ تھا۔ اس شدید تکلیف کے وقت بھی آپ کے منہ سے کوئی شکوہ نہیں نکلا۔ ان اذیت ناک لمحوں میں بھی آپ کی ساری امیدیں، ساری توجہ اپنے مالک اللہ رب العالمین کی طرف مرکوز تھیں۔ تکلیف سے بے چین ہو کر آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔

> ''اے بلند و بالا اے عظیم قدرت و سلطنت اور تدبیر و عقاب رکھنے والے! اے اپنی مخلوق سے بے نیاز، وسیع کبریائی کے مالک، ہر چیز پر قادر، تیری رحمت قریب، وعدے کو وفا کرنے والے، تیری نعمتیں کامل، تیری آزمائش بہترین، جب کوئی تجھے یاد کرتا ہے تو تو اسے یاد کرتا ہے۔ میں تجھے پکار رہا ہوں، تیری طرف متوجہ ہوں، اس بے چارگی و خوف و ہراس کے عالم میں تجھ ہی سے پناہ کا طلب گار ہوں۔
>
> اے اللہ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔ انہوں نے ہمیں فریب دیا اور پھر تنہا چھوڑ دیا۔ ہم تیرے نبی کی عترت ہیں، تیرے حبیب محمد مصطفیٰؐ کی اولاد ہیں کہ جنہیں تو نے اپنی رسالت دے کر دنیا میں بھیجا اور انہیں اپنی وحی کا امانت دار بنایا۔

پس اے سب سے مہربان! ہمارے کاموں میں ہمارے لیے کشادگی
وسہولت عطا فرما۔"

یہ مناجات امامِ مظلومؑ کسی کامیابی، خوشحالی، کشادگی یا فتح و کامرانی کے موقع پر نہیں پڑھ رہے تھے۔ اللہ رب العالمین کی یہ حمد و ثنا اس کی نعمتوں پر یہ شکر گزاری، اس کی آزمائشوں کے موقع پر اس کی عظمتوں کا یہ اعتراف، اس کے رسول تاجدار عالم حضرت محمد مصطفیؐ کا یہ تذکرہ، نواسۂ رسولؐ اس عالم میں کر رہے تھے کہ اس حالت میں کوئی دوسرا مسلمان ہوتا تو شاید اسے کلمہ پڑھنا بھی یاد نہ رہتا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی زبان ناشکری اور شکوہ شکایت سے زہر آلود ہو چکی ہوتی۔

حسینؑ تو اللہ کے رسول کے جگر کا ٹکڑا، ان کی آنکھوں کا نور، ان کے دل کا سرور تھے وہ کوئی عام مسلمان ہوتے تو وہ سوچتے کہ میں اللہ کے رسولؐ کا اس قدر پیارا تھا تو اس وقت اللہ میری مدد کو کیوں نہیں آتا۔ جب وہ اپنے رسولؐ کے بیٹے کی مدد نہیں کرتا تو پھر کس کی مدد کرتا ہوگا!

زمین پر گرنے کے بعد آپ کو کسی کروٹ چین نہیں تھا، جس طرف کروٹ لیتے اس طرف جسم مبارک میں گڑے ہوئے تیر زخموں کو پھیلانے لگتے۔ صحرا کی گرم ریت کھلے ہوئے زخموں میں گھسنے لگتی۔ کئی یزیدی فوجی گھوڑوں سے چھلانگیں مار مار کر نیچے کود چکے تھے۔ وہ خون میں ڈوبی ہوئی تلواروں کو ہوا میں گھماتے، اللہ اکبر کے فاتحانہ نعرے لگاتے۔ حلقہ بنائے مظلوم کربلا کے چاروں طرف دائرے کی شکل میں گھوم رہے تھے۔

امام مظلومؑ کے جسم کی طاقت رخصت ہو چکی تھی لیکن آپ کی زبان مبارک ان آخری لمحوں میں بھی اپنے پروردگار کی عظمت بیان کرنے میں مصروف تھی۔ امامؑ نے بہ مشکل کروٹ لی۔ آنکھیں سر کے زخموں سے بہنے والے خون سے بھر گئی تھیں۔ آپ نے اپنے گرد دیوانہ وار دوڑتے ہوئے قاتلوں کو دیکھا۔ تلواروں کی جھنکار اور نیزوں کی چمک کو محسوس کیا۔ آپؑ ریت پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف اپنے چہرہ مبارک کو بلند کر کے فرمایا۔

"اے میرے پالنے والے، میں تیری قضا پر صبر کرتا ہوں۔ بے

شک تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اے فریادیوں کی فریاد کو پہنچنے والے! تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تیرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ اے ہمیشہ رہنے والے اور مردوں کو زندہ کرنے والے! اے اپنی مخلوق کے افعال و کردار کو دیکھنے والے! تو میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کردے کہ تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

امام مظلومؑ کے ہونٹوں سے بلند ہونے والی یہ حمد وثنا سن کر شیطان کے وحشی درندوں نے ہر طرف سے مظلوم کربلا پر حملے کرنے شروع کردیے۔ کوئی تلواریں مارتا تھا، کوئی تیر چلا رہا تھا، کوئی خنجر سے حملہ کررہا تھا، کوئی راستے سے جمع کیے ہوئے نوکیلے پتھروں کی بارش برسا رہا تھا۔

لشکر یزید کا سالار، صحابی رسول کا بیٹا، ہزاروں حدیثوں کا حافظ، قرآن مجید کی آیتوں کو دن رات دہرانے والا، عمر ابن سعد قاتلوں کے درمیان سے نکل کر اپنے رسول محمد مصطفیؐ کے نواسے کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ سالار لشکر کے طور پر اس کی ذمے داری تھی کہ حسینؑ کے قتل ہونے کا منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے تا کہ یزید کے سامنے وہ اس منظر کی زیادہ سے زیادہ تفصیلات بیان کر کے اس کا دل جیت سکے۔

ایک مسلمان قاتل چوڑے پھل والے خنجر کو تھامے کسی وحشی درندے کی طرح آگے بڑھا۔ وہ امام مظلومؑ کی پشت مبارک پر سوار ہوگیا اور اس نے نواسۂ رسولؐ کی گردن پر وار کرنا شروع کردیے۔

اس وقت میدانِ کربلا رسولؐ کی نواسی جناب زینب سلام اللہ علیہا کی دل خراش آوازوں سے گونجنے لگا۔ "ہائے میرے مظلوم بھائی۔ ہائے میرے سید کی مظلومیت، ہائے اہل بیت محمدؐ کی بے بسی... کاش آسمان زمین پر گر جاتا.... کاش پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجاتے۔"

میدان کربلا میں زلزلہ آ گیا، دریائے فرات کا پانی اچھلنے لگا، سورج کا چہرہ لہو سے لال ہوگیا، ہر طرف آندھیاں چلنے لگیں، اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ آسمان سے خون کے چھینٹے

گرنے لگے۔

خلیفتہ المسلمین یزید ابن معاویہ کی فوجیں اپنی دانست میں اپنے مقاصد حاصل کر چکی تھیں۔ بدر و احد کے بدلے چکائے جا چکے تھے۔ نواسۂ رسولؐ کو ذبح کر دیا گیا تھا اور اب شیطان کے وفادار مسلمان اپنے رسولؐ کی اولاد کو خون میں نہلا کر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے، تلواروں کو لہراتے، نیزوں کو چمکاتے شمر ذی الجوشن کی سربراہی میں آگ کی مشعلیں تھامے اپنے رسول محمد مصطفیٰؐ کے گھر کو آگ لگانے خیمۂ اہل بیتؑ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

سجدۂ آخر

آپؑ نے بے اختیار آہ کی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: ”اے پالنے والے! تو جانتا ہے کہ یہ بدبخت کسے قتل کررہے ہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ پوری دنیا میں میرے علاوہ کوئی فرزند رسولؐ نہیں۔“

—*****—

امام حسین علیہ السلام نے اپنے چھ ماہ کے ننھے سے بچے کو تلوار سے کھدی ہوئی قبر میں سلایا اور ذوالفقار کا سہارا لیا اور دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب اُن کے دامن میں کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

تین دن کی بھوک نے جسم کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اصحاب و اعزہ کی لاشیں اٹھا اٹھا کر پاؤں لرزنے لگے تھے۔ عباسؑ کے بچھڑ جانے سے ہاتھ کٹ کر رہ گئے تھے۔ علی اکبرؑ کے سینے سے برچھی نکالتے نکالتے خود اپنا جگر چھلنی ہوگیا تھا۔ چھ ماہ کے علی اصغرؑ کا خون تو ان کے بازوؤں میں بہا تھا۔ سارے لباس پر لہو کے چھینٹے تھے۔ آستین اور گریبان لہو میں تر تھا۔ ماتھے اور رخساروں پر معصوم بچے کا خون جما ہوا تھا۔

حرملہ کے تیر سے علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد امام مظلومؑ نے اپنے بچے کا خون اپنے چلو میں بھر کر زمین پر ڈالنا چاہا تو زمین لرز اٹھی۔ ”ابوتراب کے بیٹے! اگر یہ خون ناحق آپ نے مجھ پر پھینکا تو قیامت تک میری سطح سے کوئی دانہ نہیں اگے گا، کوئی پھول نہیں

کھلے گا، کوئی شاخ نہیں پھوٹے گی، کوئی کلی نہیں چٹکے گی۔''

مظلوم کربلاؑ نے اس خون ناحق کو آسمان کی طرف اچھالنا چاہا تو ساتوں آسمان لرزنے لگے،، عرش الٰہی ہل کر رہ گیا۔ ہوائیں دم بہ خود ہوگئیں۔ فضائیں فریاد کرنے لگیں۔

''اے امام وقتؑ! اے ولی عصرؑ! اے رحمت اللعالمینؐ کے نور نظر! اس خون ناحق کو ہماری طرف نہ اچھالیے گا۔ اگر ایسا ہوا تو آسمانوں کا دامن بارانِ رحمت سے خالی ہوجائے گا۔ پھر نہ ان کے دامن سے کوئی بوند برسے گی، نہ زمین سے ہریالی پھوٹے گی اور نہ دنیا میں زندگی باقی بچے گی....''

امام حسینؑ نے زمین و آسمان کی فریادیں سنیں اور اصغرؑ کے خون ناحق کو اپنے چہرے پر مل لیا اور فرمایا: ''اب اسی حالت میں اپنے جد نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچوں گا۔'' اس وقت بے اختیار آپ کی زبان سے ایک نوحہ جاری ہوا۔

''یہ لوگ کافر ہوگئے ہیں۔ انہوں نے خدا کے عذاب و ثواب سے منہ پھیر رکھا ہے۔ پہلے انہوں نے علیؑ کو شہید کیا پھر ان کے بیٹے حسنؑ کو۔ یہ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے حسد اور کینے کا نتیجہ تھا۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ اب سب مل کر حسینؑ کو قتل کریں گے۔

افسوس ہے ایسے حقیر انسانوں پر جنہوں نے مجھے قتل کرنے کے لئے لوگوں کو جمع کیا، میرا خون بہانے سے نہ رکے اور کافر کی اولاد عبید اللہ ابن زیاد کے حکم سے عمر ابن سعد نے بے شمار فوج کے ساتھ مجھ پر تیروں کی بارش کر ڈالی۔

حالانکہ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں دو ستاروں کے نور پر فخر کیا کرتا تھا۔ ایک ستارہ محمدؐ تھے اور دوسرا علیؑ۔ اللہ کے برگزیدہ بندے علیؑ ابن ابی طالبؑ میرے پدر بزرگوار ہیں اور ان کے بعد میری ماں فاطمہؑ بنت محمدؐ ہیں۔ میں دو برگزیدہ ہستیوں کا فرزند ہوں میں ایسی

چاندی ہوں جسے سونے سے کشید کیا گیا ہو۔ دنیا میں کسی کا جد میرے جد رسول اللہؐ جیسا نہیں۔ نہ دنیا میں کسی کا باپ میرے باپ علی ابن ابی طالبؑ جیسا ہے۔

علی مرتضیٰؑ جو دین کی مضبوط رسی، دو قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والے، بدر وحنین میں لشکر کفر کا قلع قمع کرنے والے اور جنگ احد میں دو لشکروں پر قابو پا کر ان کا شور وغلغلہ ختم کرنے والے ہیں۔ کیا کیا اس امت نے رسولؐ اور علیؑ کی اولاد کے ساتھ.... میں خاندانِ بنی ہاشم کی پاک ومطہر ہستی علیؑ ابن ابی طالب کا بیٹا ہوں۔ میرے لیے اتنا فخر ہی کافی ہے۔ میرے جد اللہ کے رسول محمدؐ ہیں جو زمین پر چلنے والوں میں سب سے افضل ہیں۔ میری والدہ فاطمہؑ بنتِ رسول اللہؐ ہیں۔ میرے چچا جعفرؑ ہیں جنہیں اللہ نے دو پر عطا کیے ہیں جن سے وہ جنت میں پرواز کرتے ہیں۔

ہم خدا کی مخلوق کے درمیان پروردگار کی روشن وتابندہ شمع ہیں۔ کتاب خدا ہمارے ہی درمیان نازل ہوئی۔ ہم ساری مخلوق کے لئے اللہ کی پناہ اور حوض کوثر کے مالک ہیں۔ ہم اپنے دوستوں کو رسول اللہؐ کے پیالے سے سیراب کریں گے کہ ہمارے شیعہ بہترین پیروی کرنے والے ہیں۔ قیامت کے دن ہمارے دشمن سخت خسارے میں رہیں گے۔"

یہ اشعار پڑھتے پڑھتے آپ اہل حرم کے خیموں کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ خیمے جہاں صبح تک زندگی کی چہل پہل موجود تھی، اس وقت قبرستان کی طرح ویران اور اجڑے نظر آ رہے تھے۔ اصحابِ حسینؑ کے سارے خیمے خالی ہو چکے تھے۔ ان کے پردے تیز ہوا میں بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اندر کے فرش الٹے پڑے تھے۔ میدان کربلا کی خاک

اڑ اڑ کر خیموں کی ویرانی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عزیزوں کے بھی زیادہ تر خیمے ویران تھے صرف چند خیموں میں زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ صرف چند خیموں میں زندگی کی نبضیں چلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اصحاب و انصار اور شہید ہو جانے والے اعزہ و اقربا کی بیوائیں اور بچے بھی انہیں خیموں میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ انہی خیموں میں سے ایک خیمے میں حسینؑ ابن علیؑ کے بڑے فرزند سید الساجدینؑ بخار کی شدت سے بے ہوشی کی سی حالت میں ایک غالیچے پر لیٹے ہوئے تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے سب سے پہلے اسی خیمے کا پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوئے۔

خیمے میں جا کر اپنے بیٹے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو علی ابن الحسینؑ کو ہوش آ گیا۔ آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اپنے مظلوم باپ کے لباس کو خون میں دیکھا تو ان کا دل ڈوبنے لگا۔ آپ نے گھبرا کر اپنے بابا سے سوال کیا ''بابا! (چچا) حبیبؑ ابن مظاہر کہاں ہیں؟''

''وہ قتل کر دیے گئے''۔ امام حسین علیہ السلام نے بتایا۔

''بریر ہمدانیؑ ...؟'' امام زین العابدینؑ نے پوچھا۔

''وہ بھی اللہ کی بارگاہ میں قربان ہو چکے۔''

''میرے چچا عباسؑ کہاں ہیں؟''

''بیٹا! وہ شہید ہو گئے، دریائے فرات کے کنارے اُن کے بازو قلم کر دیے گئے۔'' امام نے بہ مشکل جواب دیا۔

''چچا حسنؑ کے بیٹے قاسمؑ ...''

''ان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔'' امام نے فرمایا۔

''اور میرے بھائی علی اکبرؑ ....؟''

امام حسین علیہ السلام نے اپنے فرزند کو سینے لگایا۔ ''میری آنکھوں کے نور! ان خیموں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی مرد باقی نہیں بچا۔''

یہ سن کر امام زین العابدینؑ نے جلدی سے اُٹھنا چاہا لیکن ان کی آنکھوں کے سامنے

اندھیرا سا آ گیا۔

پھر جب آپ ہوش میں آئے تو امام حسین علیہ السلام نے انہیں اسرار امامت تعلیم کیے۔ آنے والے وقت میں صبر و برداشت کی ہدایت کی، مستقبل کے لئے وصیتیں کیں اور اس کے بعد فرمایا: "میرے بیٹے! میں ایک دعا تمہیں بتا رہا ہوں اسے یاد کر لینا۔ یہ دعا میری ماں فاطمہ زہراؑ نے مجھے یاد کرائی تھی اور خود انہیں یہ دعا اللہ کے رسولؐ نے تعلیم دی تھی اور اللہ کے رسولؐ کے پاس یہ دعا جبرئیلؑ بارگاہ الٰہی سے لے کر آئے تھے۔ زندگی میں جب بھی کسی مصیبت کا سامنا ہو، کوئی سخت صدمہ پہنچے یا کوئی مشکل کام ہو تو پروردگار عالم کی بارگاہ میں دست سوال بلند کر کے عرض کرنا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

"بحقِ یٰس و القرانِ الحکیم و بحقِ طٰہٰ و القرانِ العظیم o"
اے وہ جو سوال کرنے والوں کی حاجات پوری کرنے پر قادر ہے
اے وہ کہ جو دلوں کی باتیں جانتا ہے۔ دکھیاروں کے دکھ دور کرتا
ہے اور غم زدوں کے غموں کو مٹاتا ہے۔ اے بوڑھوں پر رحم کرنے
والے، اے چھوٹے بچوں کو روزی دینے والے، اے وہ جسے شرح
بیان کی ضرورت نہیں رحمت فرما سرکار محمدؐ و آلِ محمدؐ پر اور میری یہ اور
یہ حاجات پوری فرما۔"

(اصل دُعا مفاتیح الجنان مترجمہ کے صفحہ ۱۳۹۹ پر موجود ہے)

اس کے بعد آپ نے امام زین العابدینؑ کو دوبارہ غالیچے پر لیٹ جانے کا حکم دیا اور اسی خیمے کے اندرونی دروازے سے برابر کے ایک بڑے خیمے میں داخل ہو گئے۔ یہ خیمہ بیوہ عورتوں اور یتیم ہو جانے والے بچوں سے بھرا ہوا تھا۔

جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، بی بی سکینہؑ، علی اکبرؑ کی ماں ام لیلٰیؑ علی اصغرؑ اور بی بی سکینہؑ کی والدہ ام ربابؑ، جناب قاسمؑ بن حسنؑ کی والدہ ام فروہؑ اور دوسری خواتین امام

حسین علیہ السلام کو آتے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ امام حسینؑ نے دروازے میں داخل ہوتے وقت بہ آواز بلند کہا: "یا سکینہ! یا رقیہ! یا فاطمہ! یا زینب! یا ام کلثوم، یا ام رباب، یا ام لیلیٰ، اے میری ماں کی کنیز اماں فضہ! آپ سب پر حسینؑ کا سلام۔"

امام کی آواز سن کر بی بیوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ بی بی سکینہؑ دوڑ کر بابا کے قدموں میں لپٹ گئیں۔ "بابا! بابا! کیا اب آپ بھی مرنے کو جا رہے ہیں؟"

"ہاں بیٹی! کیسے نہ جاؤں اب میرا کوئی دوست، عزیز باقی نہیں بچا۔" امام حسینؑ کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"بابا ان دشمنوں کے نرغے سے نکال کر ہمیں ہمارے جدؐ (رسول اللہؐ) کے روضے پر پہنچا دیجیے۔" جناب سکینہؑ نے بے قراری سے روتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! پرندہ قطار کو چھوڑ دیتا تو آرام کر لیتا۔" امام حسین علیہ السلام نے گلوگیر آواز میں کہا۔ یہ جملہ ایسے موقع پر بولا جاتا تھا جہاں کوئی آدمی نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ کام کرنے پر مجبور ہو۔ یوں بھی اس ڈار کے سارے پرندوں کی قطار سرخ رنگ افق شہیداں میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ اب ایک امام حسین علیہ السلام ہی باقی بچے تھے اور ان کی روح بھی اپنے ساتھیوں کے پاس جانے کو بے تاب تھی۔

حسین علیہ السلام بیوہ عورتوں اور بے آسرا یتیم بچوں کے درمیان کھڑے تھے۔ امام مظلومؑ کے خون بھرے لباس اور چہرہ مبارک پر تازہ تازہ خون دیکھ کر ہر آنکھ آنسو بہا رہی تھی، ہر دل پھٹا جا رہا تھا۔ آپؑ نے اپنی بہنوں سے کہا۔ "میری شہادت کے بعد اپنے ہوش و حواس قائم رکھنا، بے صبری نہ دکھانا، میرے بعد علیؑ ابن الحسینؑ امام وقت ہوں گے، ہر معاملے، ہر مشکل اور پریشانی میں انہی کے مشورے پر عمل کرنا۔"

اس کے بعد آپؑ نے اپنی بہن زینبؑ سے کہا کہ مجھے کوئی بوسیدہ لباس لا کر دو۔ ایک پرانا اور بوسیدہ لباس لایا گیا۔ اس لباس کو آپ نے دوسرے خیمے میں جا کر اپنے

اچھے اور قیمتی لباس کے نیچے پہن لیا۔ واپس آئے تو چھوٹی بہن ام کلثومؑ نے سوال کیا۔

''بھائی! یہ اس قدر پرانا لباس آپ نے کیوں پہنا ہے۔''

''ام کلثوم میری بہن! یزیدی فوج میں ایسے لالچی لوگ بھی موجود ہیں جو میرا قیمتی لباس اتار لیں گے تاکہ اسے بیچ کر چند درہم حاصل کر سکیں۔ پرانا لباس اس لیے پہنا ہے کہ میری لاش کی بے حرمتی نہ ہو۔'' یہ کہہ کر آپؑ نے رسولؐ اللہ کا عمامہ سر پر رکھا، علیؑ کی تلوار کمر سے باندھی اور خیمے کے دروازے کی طرف بڑھے۔

نکلتے نکلتے آپؑ کی نگاہ خیمے کے ایک کونے کی طرف جا پڑی۔ اپنے چاہنے والے باپ کی زندگی سے مایوس ہو جانے والی ان کی لاڈلی سکینہؑ سب سے الگ فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ امام مظلومؑ اپنی بیٹی کے پاس گئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''میری جان سکینہ! اب تم سے آخری بار مل رہا ہوں۔ اب تم روز قیامت حوض کوثر کے کنارے اپنے بابا سے ملو گی۔'' جناب سکینہؑ بری طرح رونے لگیں تو امام علیہ السلام نے انھیں خود سے چمٹا لیا۔

> ''میری جان! صبر کرو، روؤ نہیں سکینہ! یوں بے صبری نہ دکھاؤ۔ ابھی تو تمھیں قید و بند کے لئے تیار ہونا ہے۔ بیٹی! ابھی تو تمہارا باپ زندہ ہے لیکن جب تم میرے جسم کو زمین کربلا پر ٹکڑے ٹکڑے دیکھو تو خود کو قابو میں رکھنا۔ امت کے لئے کوئی ایسی بددعا نہ کرنا جو اسے تباہ برباد کر دے۔''

امام حسین علیہ السلام نے اپنی بیٹی کو سمجھایا، اسے دلاسا دیا، جھک کر سکینہؑ کے سر کو چوما اور باوقار انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

خیمے کے باہر خاک اڑ رہی تھی۔ اہل حرم کے خیموں کے عقبی حصے میں دشمنوں سے بچاؤ کے لئے صبح کے وقت خندق کھود کر یہاں آگ جلائی گئی تھی۔ یہ آگ اب راکھ میں تبدیل ہو چکی تھی اور یہ سرمئی راکھ ہوا گرم لُو کے تھپیڑوں کے ساتھ خندق سے نکل کر خیموں

کے آگے پیچھے ہر طرف پھیل رہی تھی۔ امام حسین علیہ السلام کی سواری کا خاص گھوڑا ذوالجناح راکھ کی سرمئی چادر پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ آنسوؤں کی لکیریں اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے دہانے تک بہہ رہی تھیں۔ امام حسین علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اس کی گردن تھپتھپائی۔ اس کے ماتھے کو سہلایا اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کلامی کی سی کیفیت میں کہا۔ ''کسی گھر میں اگر ایک آدمی مرجائے تو اس کے گھر والے اسے زندگی بھر روتے ہیں جب کہ میرے تو سارے چاہنے والے ایک دن میں مجھ سے بچھڑ گئے۔ کیسے کیسے باوفا دوست، جانثار ساتھی، بچپن کے دوست، گودوں میں کھیلنے والے، سینے پر سونے والے میری آنکھوں کے سامنے ذبح کردیے گئے.... مرتے وقت میں ان پیاسوں کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا سکا۔

امام حسینؑ روتے جاتے تھے اور اپنے ایک ایک ساتھی کو یاد کرتے جاتے تھے۔

یہ سن کے ذوالجناح تو روتا تھا زار زار
چلاتی تھیں یہ زوجہ عباسؑ نامدار
صاحب اٹھو ترائی سے میں آپ کے نثار
آقا سوار ہوتے ہیں آیا ہے راہوار
یاں آکے ساتھ جاؤ امام غیور کے
سایہ کرو کہ دھوپ ہے سر پر حضور کے

لیلیٰ پکارتی تھیں کہ اکبرؑ! کدھر ہو تم
بیٹا! پدر کے کوچ کے دن بے خبر ہو تم
تھامو رکاب باپ کی، پیارے پسر ہو تم
اماں کا گھر اجڑتا ہے، دادیؑ کے گھر ہو تم
بازو کو تھامو، ہاتھ میں حضرت کے ہاتھ دو
بیٹا! عجیب وقت ہے، بابا کا ساتھ دو

صبح سے شام کے درمیان کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ صبح کے وقت جب امام علیہ السلام اپنے خیمے سے میدان جنگ کی طرف جانے کو نکلے تھے تو ان کے اصحاب و انصار باادب مگر مستعد انداز میں راستے کے دونوں جانب قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ عباسؑ علمدار نے اپنے آقا کے سر پر علم کے سبز پھریرے کا سایہ کر رکھا تھا۔ علی اکبرؑ نے رکابوں کو پکڑ رکھا تھا۔ عونؑ و محمدؑ ذوالجناح کی گردن سہلا رہے تھے۔ زین سجی ہوئی تھی۔ ذوالجناح پیاسا ہونے کے باوجود تازہ دم اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

امام حسین علیہ السلام جب بھی کسی سفر کے لئے نکلا کرتے تو بنی ہاشم کے بہادر جوان اسی طرح ان کے اردگرد موجود ہوا کرتے تھے۔ آج صبح بھی امام علیہ السلام کی سواری اسی شان سے میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ لیکن چند گھنٹوں میں زمین آسمان بدل گئے تھے۔ امام علیہ السلام کے سارے جانثار اپنی جانیں قربان کر چکے تھے اب کوئی نہ تھا کہ ذوالجناح کی باگوں کو پکڑے اور رکابوں کو تھام کر اپنے آقا کو گھوڑے پر سوار کرائے۔

امام حسین علیہ السلام انہی یادوں، باتوں اور چہروں کو دل میں چھپائے آگے بڑھے، ذوالجناح پر پڑی ہوئی زین کو درست کیا۔ آپؑ خیمے سے بلند ہونے والی "ہائے حسینؑ، ہائے حسینؑ" کی دل دوز فریادوں کے درمیان گھوڑے پر سوار ہونے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ خیمہ عصمت کا پردہ ہٹا اور ایک دراز قد خاتون اپنے پورے وجود کو سیاہ چادر میں چھپائے خیمے سے باہر نکلیں۔ ان کے دل سے آہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، ہاتھ پاؤں میں لرزش نمایاں تھی۔ یہ خاتون کسی مستعد سپاہی کی طرح پوری شان سے قدم اٹھاتی ہوئی ذوالجناح کے قریب پہنچیں۔ پہلے انہوں نے گھوڑے کی زین پر لگی ہوئی خاک کو اچھی طرح جھاڑا پھر گھوڑے کی رکاب کو ہاتھ میں پکڑ کر امام حسینؑ کی طرف دیکھا۔ امام علیہ السلام نے ذوالجناح کی کمر پر ہاتھ رکھا اور رکاب میں پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ سیاہ پوش خاتون نے گھوڑے کی گردن پر پڑی ہوئی لگاموں کو سمیٹا اور امام علیہ السلام کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس کے بعد یہ خاتون جس شان کے ساتھ

خیمے سے باہر آئی تھیں اسی شان کے ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی خیمے میں واپس چلی گئیں۔

یہ خاتون کوئی اور نہیں نبیؐ کی نواسی، علیؑ کی بیٹی، فاطمہؑ کی نور نظر اور حسین علیہ السلام کی بہن زینبؑ بنتِ علیؑ تھیں۔ وہ کب یہ برداشت کرسکتی تھیں کہ ان کا بھائی، ساری خلق کا امامؑ جو سفر پر جانے کے لئے بڑی شان سے گھوڑے پر سوار ہوا کرتا تھا، اپنے آخری سفر پر جائے تو نہ کوئی اس کے گھوڑے کی رکاب تھامنے والا ہو، نہ کوئی گھوڑے کی لگامیں پکڑنے والا، انہوں نے سوچا۔ کیا ہوا جو عباسؑ نہیں ہیں، کیا ہوا جو علی اکبرؑ نہیں ہیں، کیا ہوا جو عونؑ و محمدؑ اور قاسمؑ نہیں ہیں۔ کوئی نہیں مگر حسینؑ کی بہن زینبؑ تو موجود ہے۔

شہیدوں کی ساری ذمے داریاں ایک ایک کرکے زینبؑ کے شانوں پر آتی جارہی تھیں۔

☆☆☆

میدان کربلا یزیدی درندوں کی چیخ و پکار سے گونج رہا تھا۔ کوفے کے فوجی دستوں کی خوشی اور اعتماد دیدنی تھا۔ نماز فجر سے لے کر عصر سے پہلے تک وہ حسین علیہ السلام کے سارے دوستوں، رشتے داروں کو قتل کرچکے تھے، اب تین دن کے بھوکے پیاسے کو قتل کرنا کیا مشکل تھا۔ حسین علیہ السلام کے قتل ہوتے ہی عمر ابن سعد کا یہ مشن تکمیل کو پہنچ جاتا۔

فوج کے سردار چاہتے تھے کہ ایک ساتھ حملہ کرکے حسین علیہ السلام کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالیں لیکن ان کے مقابلے میں کوئی عام جذباتی انسان نہیں تھا۔ ان کے مقابل حسین علیہ السلام تھے جنہیں نہ زندہ رہنے کی آرزو تھی اور نہ مرجانے کی جلدی۔ آپ کسی بات سے مشتعل ہونے والے نہیں تھے۔ آپؑ کو معلوم تھا کہ انہیں اب کچھ دیر بعد اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کرنا ہے۔ ان کی جنگ کسی قسم کے اشتعال، انتقام، جذباتی پن یا دشمن کو ذلیل و خوار دیکھنے کے لئے نہیں تھی۔ اپنے گھر سے دوری، سفر کی صعوبتیں، جانوں کی قربانیاں، خاندان رسالتؐ، خاندان ابوطالبؑ کی تباہی و بربادی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ یہ ساری مصیبتیں آپؑ صرف اس لئے برداشت کررہے تھے کہ ان کی

قربانیوں کو دیکھتے ہوئے شاید مسلمانوں کو ہوش آجائے، شاید وہ اپنے اور اپنے دین کے دشمنوں کے چہروں کو پہچان سکیں، شاید انہیں صراط مستقیم نظر آجائے، شاید رسول اللہؐ کی امت شیطان کی فرماں برداری کرنا چھوڑ دے!

اسی لیے کوفے کی فوج کی تمام تر اشتعال انگیزیوں کے باوجود امام حسین علیہ السلام نے صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ نواسہ رسولؐ اپنے نانا کی امت کو آخری مرتبہ اللہ کے پیغام اور رسول اللہؐ کی سنت کو یاد دلانا چاہتے تھے کہ شاید اب بھی کسی مسلمان کا ضمیر جاگ جائے اور وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے۔ آپؑ نے یزیدی فوجیوں کے شور مچاتے جتھوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اپنا زخمی ہاتھ اوپر اٹھایا اور بہ آواز بلند فرمایا۔ ''اے خدا کے بندو میری بات سنو!''

امام علیہ السلام کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے ہی تھی کہ شور مچاتے فوجی، بلبلاتے اونٹ، اچھلتے، ہنہناتے گھوڑے سب کے سب ایک لمحے میں ساکت اور خاموش ہو کر رہ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے سارے جیتے جاگتے پرشور اور متحرک منظر کو ایک لمحے میں ساکت اور خاموش تصویر میں بدل دیا ہو۔ اس کے بعد میدان کے اس سناٹے میں نواسۂ رسولؐ، امام وقتؑ، ولی عصرؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کی آواز گونجی:

> ''خدا کے بندو! خدا سے ڈرو۔ دنیا کی چمک دمک کے پیچھے نہ بھاگو۔ یہ دنیا اگر ہمیشہ رہنے والی ہوتی اور اگر کوئی شخص دنیا میں ہمیشہ کی زندگی کا حق رکھتا تو اللہ کے نبیؐ اور پیغمبرؐ ہمیشہ کی دنیاوی زندگی کے زیادہ حق دار تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ نے اس دنیا کو آزمائش کی جگہ اور دنیا والوں کو فنا ہو جانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ (تم دیکھتے ہی ہو کہ) یہاں ہر چیز پرانی ہو جاتی ہے اور ہر نعمت آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں کی خوشیاں رنج وغم میں بدل جاتی ہیں۔ دنیا رہنے کی جگہ نہیں یہ راستے کے لئے سامان سفر حاصل کرنے کی

جگہ ہے۔ (اس لئے یہاں سے جلد از جلد اگلی منزل پر پہنچنے کے
لئے) زادِ راہ، سامانِ سفر تیار کرلو اور بہترین زادِ سفر تقویٰ (یعنی اللہ
سے ڈرنا) ہے۔ تقویٰ اختیار کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔"

اپنی جان کے دشمنوں کو ان کی فلاح و کامیابی کے لئے یہ بہترین نصیحت کرکے آپؑ خاموش ہو گئے۔ اور آپؑ کے خاموش ہوتے ہی میدانِ جنگ کی ساکت اور خاموش تصویر یہاں سے وہاں تک دوبارہ پُرشور اور متحرک منظر میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ نعرے بلند ہونے لگے، تلواریں اور نیزے اچھلنے لگے، سواری کے جانور آگے پیچھے دوڑنے بھاگنے لگے۔ لشکر یزید کا سالار عمر ابن سعد پوری طاقت سے چلایا۔ "بہادرو! آگے بڑھو اور حسینؑ ابن علیؑ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔"

اس آواز کے ساتھ ہی ہزاروں تیر ہوا میں سنسنائے، ہزاروں تلواریں نیاموں سے باہر آئیں اور ہزاروں نیزہ بازوں نے اپنے نیزوں کو سیدھا کرکے گھوڑوں کو پوری رفتار سے نواسہ رسولؐ کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔

یہ دیکھ کر حسینؑ ابن علیؑ کے تیور بدلے، چہرے پر غیض و غضب کے آثار نمودار ہوئے۔ آپؑ نے علیؑ کی ذوالفقار کو نیام سے کھینچا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا بجلی کی طرح آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ یزیدی درندے امام حسینؑ تک آئیں، امام حسین علیہ السلام غصے میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح ان صحرائی کتوں پر حملہ آور ہو گئے۔

دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ اتنے عزیزوں کی لاشیں اٹھانے والا، اپنے جانثاروں کو قتل ہوتے دیکھنے والا تین روز کا بھوکا پیاسا انسان ان سے کیا لڑے گا لیکن امام حسینؑ آگے بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے اور صحرائی کتوں کو اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ آپ حملہ کرتے جاتے اور کہتے جاتے۔ "تین روز کے بھوکے پیاسے کی جنگ دیکھو.... جس کا جوان بھائی مر گیا اس کی جنگ دیکھو۔ جس کا کڑیل جوان بیٹا مارا گیا اس کی جنگ دیکھو...."

امام حسین علیہ السلام کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ یزیدی فوج کی صفیں تتر بتر ہو کر رہ گئیں۔ فوج کے پچھلے دستے ایسے خوف زدہ ہوئے کہ انہوں نے کوفے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کوفے کی فوج کا سپہ سالار دہشت کے مارے ایک خیمے میں جا چھپا، شمر ذی الجوشن حواس باختہ ہو کر اپنے گھوڑے کو ادھر سے ادھر دوڑانے لگا اور آہستہ آہستہ پوری فوج پسپا ہوتی چلی گئی۔

اب امام حسینؑ تپتی دھوپ میں تنہا اپنے گھوڑے پر سوار گرمی، پیاس اور تھکن سے چور ہو کر لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ مظلوم کربلا نے یہ بے پناہ حملہ اس لئے کیا تھا تا کہ دشمن ان کی طاقت کا اندازہ لگائے اور یزیدی فوج ہی نہیں دیکھنے والے واقعہ نگار اور آنے والے زمانوں میں تاریخ کے ان انمٹ واقعات کو نسل در نسل پہنچانے والے مورخ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ حسینؑ اپنی کمزوری کی وجہ سے مارے گئے۔ آنے والے زمانوں کے اہل قلم نسل در نسل اس غلط فہمی کو بھی دور کرتے رہیں کہ حسین ابن علیؑ تلوار کے ذریعے حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اسی لئے جب ساری فوج پسپا ہو گئی تو سیّد الشہدا نے محسوس کیا کہ اب وہ لمحہ قریب ہے جسے یاد کر کے ان کی ماں فاطمہ زہراؑ گھنٹوں آنسو بہایا کرتی تھیں وہ وقت آ گیا ہے جس کے تصور سے ان کے بابا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی راتوں کی نیندیں اچاٹ ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ گھڑیاں اب زیادہ دور نہیں جن کے خیال سے ان کے نانا رسول اللہ نمازوں میں اپنے سجدوں کو طول دیا کرتے اور جب سجدے سے سر اٹھاتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں کی شدت سے سرخ ہوا کرتیں۔

یہ سب سوچتے سوچتے آپ نے اپنی خون میں ڈوبی ہوئی تلوار کو نیام میں رکھ لیا اور اپنی ساری توجہ اپنے پالنے والے کی طرف مرکوز کر کے اپنا سر جھکا لیا۔

یہ منظر دیکھ کر بھاگنے والے پلٹنے لگے، تلواریں سیدھی ہوئیں، تیروں کا مینہ برسنے لگا۔ نیزوں کی انیاں نواسۂ رسولؐ کی طرف لپکنے لگیں۔ ہر طرف سے نوکیلے پتھروں کی بارش

شروع ہوگئی۔ ایک پتھر ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور پوری طاقت سے مظلوم کربلاؑ کی پیشانی سے ٹکرایا۔ آپ نے پیشانی سے ابلنے والے خون کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنا چاہا تھا کہ کہیں سے زہر میں بجھا ہوا تین بھال کا تیر سنسناتا ہوا آیا اور پوری طاقت سے امام مظلومؑ کے سینے میں اتر گیا۔ آپؑ نے بے اختیار آہ کی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: "اے پالنے والے! تو جانتا ہے کہ یہ بدبخت کسے قتل کر رہے ہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ پوری دنیا میں میرے علاوہ کوئی فرزند رسولؐ نہیں۔"

ابھی آپ آسمان کی طرف رخ کیے فریاد کر ہی رہے تھے کہ یزیدی فوج کے ایک سفاک درندے نے اپنے نیزے کو سیدھا کیا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا امام عالی مقامؑ پر حملہ آور ہوا۔ نیزے کا وار اتنا شدید تھا کہ امام مظلومؑ اپنے گھوڑے پر ڈگمگا گئے۔ پھر رکابوں سے آپ کے پاؤں نکلے اور آپ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے درمیان زمین کربلا کی گرم ریت پر گر کر بے قراری سے تڑپنے لگے۔

آپ کے گرتے ہی گھڑ سواروں نے وحشیانہ نعرے لگائے اور اپنے گھوڑوں کو امام علیہ السلام کے چاروں طرف دوڑانے لگے۔

نواسہ رسولؐ کا سارا جسم زخموں سے چور تھا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف تیر گڑے ہوئے تھے ہر زخم سے خون ابل رہا تھا اور جسم کی طاقت لحہ بہ لحہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت آپؑ گرم ریت پر کروٹیں بدلتے جا رہے تھے اور اپنے پالنے والے مہربان مالک سے مناجات کرتے جا رہے تھے۔

اے بلند و اعلیٰ خدا... اے عظیم قدرت و سلطنت کے مالک... اے بے نیاز... اے ہر چیز پر قادر... تیری رحمت قریب، تیرا وعدہ پورا ہونے والا، تیری نعمتیں بے شمار، تیری آزمائش بہترین....

تجھے جب بھی پکارا جائے تو تو سب سے قریب.... اے میرے مالک! جب بھی کوئی تجھے یاد کرے تو تو اسے یاد کرتا ہے۔

اے مہربان! میں تجھے ضرورت کے وقت پکار رہا ہوں تیری ہی جانب متوجہ ہوں۔ میں بالکل بے بس ہو چکا ہوں۔ خوف و ہراس کی حالت میں تجھ ہی سے پناہ کا طلب گار ہوں۔ ناتوانی کے وقت تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں تجھ ہی پر میرا یقین ہے.... ہمارے لئے بس تو ہی کافی ہے.....

اے اللہ ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔ انہوں نے ہمیں فریب دیا اور پھر تنہا چھوڑ دیا....

اے مالک! ہم تیرے نبیؐ کی عترت ہیں.... تیرے حبیب محمد مصطفیٰؐ کی اولاد ہیں... اے سب سے زیادہ مہربان.... ہمیں کشائش و کشادگی عطا فرما....''

اس وقت آپؑ کے چاروں طرف گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ گرد و غبار اُڑ رہا تھا۔ آپؑ اللہ سے فریاد کر رہے تھے اور کئی سفاک درندے تلوار سونتے آپ کے گرد کھڑے حمد و ثنا کی آوازوں کے ختم ہو جانے کے منتظر تھے۔ اس لئے جیسے آپ خاموش ہوئے شبث ابن ربعی اپنا تیز دھار خنجر لے کر آپؑ کی طرف بڑھا۔ لیکن امام مظلومؑ نے اپنی خوں بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ دہشت کے مارے الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔ امام مظلومؑ نے پہلو بدلتے بدلتے آسمان کی طرف دیکھا اور ڈوبتی نبضوں اور مدہم ہوتی آواز کے ساتھ اپنے مالک سے عرض کی۔

''اے میرے پالنے والے! میں تیری آزمائش پر صبر کر رہا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں.... اے فریادیوں کی فریاد کو پہنچنے والے! تیرے سوا میرا کوئی پروردگار نہیں... تیرے سوا کوئی معبود نہیں... میں تیرے حکم پر صبر کروں گا....

اے اس کے فریاد رس جس کا تیرے سوا کوئی فریاد رس نہیں۔ تو

میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کردے کہ تو بہترین فیصلہ
کرنے والا ہے۔"

اس دوران کئی سفاک قاتل امام مظلومؑ کے سرمبارک کو گردن سے جدا کرنے کو آگے بڑھے۔ ہر شخص اس اعزاز اور اس کے بدلے میں یزید کے دربار سے ملنے والے انعام و اکرام کو حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جب وہ مظلوم کربلاؑ کے قریب آتے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا۔

آخر دنیا کا بدترین، ظالم ترین انسان شمر ذی الجوشن خونی درندے کی طرح نواسہ رسولؐ کی طرف بڑھا۔ شمر ذی الجوشن نے اپنے خنجر سے امام حسین علیہ السلام کی گردن پر وار کرنا چاہا تو امام عالی مقامؑ نے اس سے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟"

شمر نے ایک وحشیانہ قہقہ لگایا۔ "اچھی طرح جانتا ہوں، پہچانتا ہوں۔ آپ کی والدہ فاطمہؑ بنت محمدؐ، آپ کے والد علیؑ ابن ابی طالبؑ اور آپ کے جد محمد مصطفیٰؐ ہیں لیکن...اس کے باوجود میں آپ کو قتل کر دوں گا۔ مجھے کسی کا خوف نہیں....."

یہ سن کر کر امام علیہ السلام نے ڈھلتے ہوئے سورج پر نگاہ کی اور سجدۂ آخر کے لئے اپنا سر کربلا کی خاک پر رکھ دیا۔

☆☆☆☆☆

سرخ آندھی

۱۶ ربیع الاول سنہ ۶۶ ہجری کو انتقام خون حسینؑ کی سرخ آندھی نے کوفے میں حرکت کرنا شروع کی تھی اور اس نے بہت جلد کوفے کی ظالم حکومت کا خاتمہ کرکے دارالامارہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس سرخ آندھی کا نام تھا مختار ثقفی۔

—★★★★★—

واقعہ کربلا کو گزرے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ نواسۂ رسولؐ اور ان کے اہل بیتؑ پر یزیدی حکومت نے جو مظالم کیے تھے۔ وہ اب زبان زدِ عام تھے۔ کربلا سے مدینے اور کوفے سے شام تک زیادہ تر شہروں اور قصبوں میں یزیدی حکومت سے نفرت کا اظہار کیا جارہا تھا۔ انتقامِ خونِ حسینؑ کی سرخ آندھی آہستہ آہستہ سارے ملک پر پھیلتی جارہی تھی۔ یزید ملعون اپنے بدترین انجام تک پہنچ چکا تھا، لیکن اس کی فوج کے بڑے بڑے افسر اور کربلا میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ، ان کے باوفا اصحابؓ اور خاندان رسالتؐ پر ظلم و ستم کرنے والے بہت سے لوگ ابھی زندہ تھے۔

۱۶ ربیع الاول سنہ ۶۶ ہجری کو انتقامِ خونِ حسینؑ کی سرخ آندھی نے کوفے میں حرکت کرنا شروع کی تھی اور اس نے بہت جلد کوفے کی ظالم حکومت کا خاتمہ کرکے دارالامارہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس سرخ آندھی کا نام تھا مختار ثقفی۔

☆☆☆

مختار ثقفی کا تعلق قبیلہ بنی ثقیف سے تھا۔ ان کے والد صحابی رسولؐ جناب ابوعبیدہؓ ابن مسعودؓ تھے اور بہادر سپاہی مانے جاتے تھے۔ ایک روز امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام مدینے کی ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ وہاں ایک بچہ کھیل میں مصروف تھا۔ آپؑ نے لوگوں سے معلوم کیا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ ایک شخص نے بتایا کہ یہ صحابی رسولؐ ابوعبیدہؓ ابن مسعودؓ کا فرزند ہے۔ یہ سن کر امیر المومنین علیہ السلام نے اس بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کلامی کی سی کیفیت میں کہا۔ ''اے میرے بیٹے! وہ وقت کب آئے گا جب تم ہمارے دشمنوں سے انتقام لو گے۔''

سولہ ربیع الاول سن چھیاسٹھ ہجری کو وہ وقت آ چکا تھا جس کی پیش گوئی امیر المومنین علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ کوفے کی حکومت اب مختار ثقفی کے قبضے میں تھی۔ وہ کوفہ جو کبھی اہل بیتؑ سے محبت کرنے والوں کا شہر خموشاں بن گیا تھا۔ جہاں یزیدی گورنر عبیداللہ ابن زیاد کی تلوار بے شمار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی اور جس شہر کے گلی کوچوں میں امام زین العابدینؑ کے پاؤں سے مسلسل رسنے والے خون اور اسیران کربلا کے آنسو جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے، اس شہر پر اب مختار ثقفی کی بہادر فوجوں کا قبضہ تھا۔

شہر کے بیرونی راستے سیل کر دیے گئے تھے اور کربلا میں نواسہ رسول پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا جا رہا تھا۔ قاتلانِ حسین میں سے بہت سے لوگ مارے جا چکے تھے لیکن چند مشہور لوگ ابھی تک کہیں چھپے ہوئے تھے۔ شمر ذی الجوشن، اسحاق ابن اشعث، سنان ابن انس، عمر ابن سعد اور خولی اصبحی انہی لوگوں میں شامل تھے۔ یہ لوگ ابھی تک کوفے ہی میں کہیں چھپے ہوئے تھے اور حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔

☆☆☆

یہ کوفے کا ایک سرحدی گاؤں تھا۔ شمر ذی الجوشن اور سنان ابن انس اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اسی گاؤں کے باہر ایک باغ میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک دن شمر ذی

الجوشن نے ایک مقامی آدمی کو رشوت دے کر گاؤں کی مسجد کے پیش نماز کے پاس بھیجا۔ پیش نماز اور مسجد کا مؤذن شمر کا پیغام ملتے ہی وہاں پہنچ گئے۔ شمر نے ان سے کہا کہ وہ دو ایسے آدمیوں کا انتظام کریں جو شہر کے عام راستوں کی بجائے خفیہ راستوں کے ذریعے شہر سے باہر نکل سکیں۔

شمر ان لوگوں کے ذریعے مدینے میں مصعب ابن زبیر کے پاس اپنا پیغام بھیجنا چاہتا تھا۔

پیش نماز نے ایسے دو آدمیوں کا انتظام کر دیا۔ یہ دونوں افراد چھپتے چھپاتے اس گاؤں سے نکلے اور خفیہ راستے کی طرف بڑھنے لگے۔

مختار ثقفی اور شہر کے کوتوال عبداللہ بن کامل کو ان لوگوں کی موجودگی کی سُن گُن مل چکی تھی۔ عبداللہ بن کامل کے سپاہیوں اور جاسوسوں نے پہلے ہی اس علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ شمر کے قاصد ابھی گاؤں سے نکلے ہی تھے کہ عبداللہ بن کامل کے سپاہیوں نے انہیں روک لیا۔ تفتیش کی گئی تو ان میں سے ایک قاصد نے بتایا کہ ہم خط دینے والے کا نام تو نہیں جانتے لیکن یہ جانتے ہیں کہ یہ خط ایک انتہائی مکروہ شکل وصورت والے آدمی نے ہمیں دیا ہے۔

''اس کا حلیہ بیان کو۔'' عبداللہ بن کامل نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''اس کی.... اس کی ناک چپٹی ہے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، رنگت سیاہ، چہرے اور جسم پر برص کے سفید داغ ہیں۔ وہ بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھنے لگتے ہیں۔'' ایک قاصد نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ شخص شمر ذی الجوشن کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسی نے میرے آقا و مولا کا سر مبارک ان کی گردن سے جدا کیا تھا۔'' عبداللہ بن کامل کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ ان کا دل شمر کو موت کے گھاٹ اتارنے کو بے تاب تھا۔

''ان لوگوں کو گھوڑوں پر بٹھا کر ساتھ لے چلو یہ لوگ شمر کا پتہ بتائیں گے۔'' عبداللہ

بن کامل نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ان دونوں قاصدوں کو بھی گھوڑوں پر بٹھا لیا گیا اور مختار ثقفی کا یہ فوجی دستہ گاؤں کی طرف بڑھنے گا۔

☆☆☆

شمر ذی الجوشن اور اس کے ساتھی باغ کے گھنے حصے میں چھپے ہوئے تھے کہ اچانک انہیں ہر طرف سے گھیر لیا گیا۔ عبداللہ بن کامل کے سپاہیوں کے فلک شگاف نعروں سے سارا باغ گونج رہا تھا۔ تلواروں کی سنسناہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کو سن کر شمر ذی الجوشن اتنا بدحواس ہوا کہ بے اختیار تلوار کھینچ کر باہر نکل آیا۔ خیمے کے باہر موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ عبداللہ بن کامل کے ایک سپاہی نے تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ شمر کو چیخنے تک کی مہلت نہ ملی۔ اس کا لمبا، مکروہ جسم کٹے ہوئے پیڑ کی طرح زمین پر گر کر بے حرکت ہو گیا۔ تلوار کے وار نے اس کے سر کو پیشانی تک دو ٹکڑے کر دیا تھا۔

اتنی دیر میں سنان ابن انس، اسحاق ابن اشعث، حارث بن عروہ اور دوسرے قاتلان حسین بھی تلواریں سونت کر باہر نکل آئے لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ قتل کر دیے گئے یا انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

گرفتار ہونے والوں میں سنان ابن انس بھی شامل تھا۔ اسے جب شہر میں لایا گیا تو ہر شخص اس کے منہ پر تھوک رہا تھا۔ اس قاتلِ حسین سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ مشتعل ہجوم نے اسے عبداللہ بن کامل کے سپاہیوں سے چھین لیا اور اپنی تلواروں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اسحاق ابن اشعث بھی زندہ گرفتار ہوا تھا۔ اسے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

اسحاق ان نو ملعونوں میں شامل تھا جنہوں نے مظلوم کربلا کی شہادت کے بعد آپؑ کے جسم مبارک پر گھوڑے دوڑائے تھے۔ یہ شخص مختار ثقفی کے نائب عبداللہ بن کامل کا سالا تھا۔ عبداللہ بن کامل نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ حسین علیہ السلام کے کسی قاتل کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ قریبی رشتے داری کی وجہ سے عبداللہ کچھ دیر تک کشمکش کے عالم میں رہے۔

آخر انہوں نے جناب مختار ثقفی سے کہا کہ میں اسحاق کا سامنا نہیں کرنا چاہتا اسے اس کے جرم کی سزا آپ اپنے کسی دوسرے غلام سے دلوائیں۔

آخر مختار ثقفی کے ایک غلام نے اسحاق ابن اشعث کا سر اڑا دیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن کامل اپنے گھر گئے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو اس کا مہر دے کر طلاق دے دی اور دوبارہ قاتلانِ امام حسینؑ کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

(اس سلسلے میں بعض تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اسحاق اور مزید نو افراد جنہوں نے لاش مبارک پر گھوڑے دوڑائے تھے ان سب کو زمین پر لٹا کر ان کے اوپر گھوڑے دوڑائے گئے۔ جیسا ظلم اُنہوں نے کیا تھا ویسی ہی سزا اُنھیں دی گئی۔)

عمر ابن سعد جو کربلا میں لشکر یزیدی کا سپہ سالار تھا، ابھی تک ہاتھ نہیں آیا تھا۔ عمر ابن سعد ہی وہ شخص تھا جس کی سفارش پر ابن زیاد نے جناب مختار ثقفی کو قید خانے سے آزاد کیا تھا۔ عمر ابن سعد جناب مختار ثقفی کا بہنوئی تھا۔ اسحاق ابن اشعث کے قتل ہونے کے بعد مختار ثقفی نے عبداللہ ابن کامل سے کہا کہ آج تمہارا ایک عزیز قتل ہوا ہے اور کل میں اس شخص کو موت کے گھاٹ اتاروں گا جو میرا عزیز ہے۔ جناب مختار کا اشارہ عمر ابن سعد کی طرف تھا۔ آپ جانتے تھے کہ عمر ابن سعد ہی نے انہیں آزاد کرایا تھا لیکن یہ مختار ثقفی پر اس کا ایک ذاتی احسان تھا۔ لیکن اس نے نواسۂ رسولؐ کو قتل کر کے جو عظیم گناہ کیا تھا، مختار ثقفی اس گناہ پر اسے معاف نہیں کر سکتے تھے۔

اگلے دن عمر ابن سعد کو گرفتار کر لیا گیا۔ سپاہیوں نے مختار کو اطلاع دی کہ عمر ابن سعد گرفتار ہو گیا ہے۔ جناب مختار نے اس کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہ کیا اور اپنے ایک غلام کو حکم دیا کہ جا کر امامِ مظلوم کے اِس قاتل کا سر اس کے تن سے جدا کر دو۔ اس طرح حکومت کی لالچ میں نواسۂ رسولؐ کو بھوکا پیاسا شہید کرنے والا یہ لالچی انسان بھی اپنے انجام کو پہنچا۔

انتقام خون حسینؑ کی یہ سرخ آندھی ١٦ ربیع الاول سنہ ٦٦ ہجری سے ١٥ رمضان المبارک سنہ ٦٧ ہجری تک اسی طرح چلتی رہی۔ اس عرصے میں کربلا میں یزیدی لشکر میں

شامل ہونے والے زیادہ تر سفاک درندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

نوٹ: ائمہ معصومینؑ کی متواتر احادیث میں کہا گیا ہے کہ امام مظلومؑ کا انتقام امام زمانہ حضرت قائم آلِ محمدؑ لیں گے۔ بے شمار دشمنانِ امام حسینؑ قتل کیے جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت جب بے شمار لوگ مارے جاچکے ہوں گے تو قائم آلِ محمدؑ کے ساتھی آپؑ سے کہیں گے کہ آقا! اب بہت لوگ مارے جاچکے، بہت خون بہہ چکا۔ اب تلوار روک لیجئے۔ اس وقت امام زمانہ علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑیں گے اور آپ فرمائیں گے کہ ابھی میرے جد کا انتقام کہاں مکمل ہوا۔ میرے جد کی جوتیوں میں جو آپؑ کا خون جمع ہوگیا تھا، ابھی تو میں نے اُس خون کا بدلہ بھی پوری طرح نہیں لیا۔ خونِ امام حسینؑ کا اصل انتقام تو اللہ تعالیٰ لے گا۔

یہ احادیث پڑھ کر ہم جیسے کم علم آدمی بھی سوچتے ہیں کہ آخر ایک امامؑ کے بدلے میں اتنے لوگ کیوں مارے جائیں گے! پھر ایک دن بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ اگر ایک عالم، ایک عام آدمی کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بدلے میں ایک لاکھ کتے مار دیے جائیں تو اس ایک آدمی کے قتل کا بدلہ پھر بھی نہیں لیا جاسکے گا۔ قاتلانِ امام حسینؑ کا جرم و ظلم اتنا زیادہ ہے کہ اس کا اصل بدلہ صرف اللہ ہی لے سکتا ہے۔ وہ کس طرح یہ بدلہ لے گا، اس بات کو خود ہی جانتا ہے۔ ہم تو لاکھوں کتے مار کر ایک عام انسان کا بدلہ نہیں لے سکتے تو نواسۂ رسولؐ کے قاتلوں سے کس طرح ان کے ظلم کا بدلہ لے سکتے ہیں!

☆☆☆☆☆

قاتل کا انجام

انتقام خون حسینؑ کی یہ سرخ آندھی جس قدر تیزی سے اٹھی اسی قدر تیزی سے ختم بھی ہوگئی لیکن ختم ہونے سے پہلے اس کے طاقت ور بگولوں نے قاتلان امام حسینؑ میں سے ایک ایک کو چن چن کر اٹھایا اور انہیں جہنم کے شعلوں میں لے جا کر پھینک دیا۔

—*****—

کربلا کے المناک سانحے کو چند سال گزرے تھے کہ یزید ابن معاویہ جو واقعہ کربلا کے بعد ایک نفسیاتی مریض بن گیا تھا، سن ۶۴ ہجری میں عبرت ناک موت کا شکار ہوگیا۔ اس کے مرنے کے بعد عرب کے بادشاہ گر طبقوں اور بنوامیہ کی نوکر شاہی نے یزید کے بیٹے معاویہ بن یزید کو تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ معاویہ بن یزید اپنے بزرگوں اور باپ کو اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ دوسروں کے سامنے خود کو مسلمان کہتے تھے لیکن اندرونی طور پر ان کی زندگی بت پرستوں سے ملتی جلتی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو دھوکا دے کر اسلامی حکومت پر قبضہ ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور محافظ اسلام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خاندان سے بدر واحد کی جنگوں میں مرنے والے اپنے عزیزوں کے خون کا بدلہ لے سکیں۔ اس کا عملی ثبوت وہ اپنے باپ کی بادشاہت کے زمانے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

معاویہ بن یزید ایک با ضمیر انسان تھا۔ بنو امیہ کے حکمرانوں کے درمیان اس کی حیثیت کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول کے پھول کی طرح تھی۔ اس نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی ایک لمبی تقریر کی اور اپنے بزرگوں کے ظلم وستم، چالاکیوں اور سازشوں کا کھلے عام اقرار کرنے کے بعد تخت حکومت کو ٹھوکر مار کر اس پر سے اتر آیا۔

بنو امیہ کی خفیہ ایجنسیاں، بادشاہ گر طبقے اور نوکر شاہی اس اعتراف جرم کو بھلا کس طرح برداشت کر سکتی تھی جس نے ان کے چہروں پر لگی ہوئی سیاہی کو اور گہرا کر دیا تھا اسی لئے معاویہ بن یزید جیسے حق پرست کو خفیہ طریقے پر زہر دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور اس کی موت کے ساتھ ہی ابوسفیان کی خاندانی بادشاہت کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ معاویہ بن یزید کے بعد بنی امیہ کی مروانی شاخ کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اس شاخ کا سب سے پہلا بادشاہ مروان بن حکم کو بنایا گیا۔

یہ وہی مروان تھا جسے اللہ کے رسولؐ نے اس کی سازشوں کے سبب اپنے زمانے میں مدینے سے نکال دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور حکومت میں اسے مشیر کا عہدہ دے کر مدینے واپس بلا لیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مہر خلافت مروان ہی کے پاس رہا کرتی تھی۔ مروان بن حکم نے بعد کے زمانوں میں بھی امیرِ شام کی بڑی مدد کی تھی۔

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام مدینے سے روانگی سے پہلے جب مدینے کے حاکم ولید بن عقبہ کی دعوت پر گورنر ہاؤس گئے تھے اور اس کے سوال بیعت کے جواب میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے تو مروان بن حکم مرکزی حکومت کے جاسوس اور صوبائی مشیر کی حیثیت سے حاکم مدینہ کے پاس بیٹھا تھا اور اسی نے ولید بن عقبہ سے کہا تھا کہ حسین اگر اس وقت تمہارے ہاتھ سے نکل گئے تو پھر ہاتھ نہیں آئیں گے اس لئے یا تو حسین سے بیعت لے لو ورنہ اسی وقت حسین کا سر قلم کر دو۔

یہی وہ شخص تھا جس نے حکومت شام کے حکم پر نواسہ رسولؐ حضرت امام حسنؑ کو زہر کے ذریعے شہید کرنے کا سارا انتظام کیا تھا۔ امام حسن علیہ السلام کو دیا جانے والا زہر اسی

کے ذریعے امام حسنؑ کی زوجہ جعدہ بنتِ اشعث تک پہنچا جسے خود مروان نے اس کام کے لئے تیار کیا تھا۔

دین اسلام کے خلاف اپنی زہریلی سازشوں کی وجہ سے رسول اللہؐ کے حکم سے مدینہ بدر ہونے والا مروان بن حکم اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس بادشاہت کے انتظار میں اس نے ساری دنیا کے گناہ سمیٹ لیے تھے لیکن جب مسلمانوں کی بادشاہت اس کے ہاتھ آئی تو یہ صرف ایک سال حکومت کر سکا۔ ایک سال کے بعد یہ جہنم کے بھڑکتے شعلوں میں جا پہنچا اور حکومت کی باگ ڈور اس کے بیٹے عبدالملک بن مروان کے ہاتھوں میں آ گئی۔

عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں مختار ثقفی کے نام سے عراق سے ایک سرخ آندھی اٹھی اور اس نے بنوامیہ کے تخت و تاج کو ہلا کر رکھ دیا۔ انتقام خون حسینؑ کی یہ سرخ آندھی جس قدر تیزی سے اٹھی اسی قدر تیزی سے ختم بھی ہوگئی لیکن ختم ہونے سے پہلے اس کے طاقت ور بگولوں نے قاتلان امام حسینؑ میں سے ایک ایک کو چن چن کر اٹھایا اور انہیں جہنم کے شعلوں میں لے جا کر پھینک دیا۔

☆☆☆☆

مدینہ منورہ گہری اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ واقعہ کربلا کو گزرے کئی برس گزر گئے تھے۔ مدینے میں روز مرہ کے کام اسی طرح ہوتے تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ لوگ سوتے میں چل رہے ہیں اور جاگتے میں سو رہے ہیں، دل بجھے ہوئے تھے۔ ذہن بوجھل تھے۔ محلّہ بنی ہاشم کے بہت سے گھر کھنڈرات کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ ان گھروں کے رہنے والے مرد اور بچے کربلا میں اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کر کے وہیں کے ہو رہے تھے۔ حکومت سے بغاوت کے جرم میں ان کے گھروں کو واقعہ کربلا کے چند دنوں بعد ہی مسمار کر دیا گیا تھا۔ مسلمؑ بن عقیلؑ اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے گھروں کی چھتیں اور دیواریں زمین بوس کر دی گئی تھیں اس لئے کہ انہوں نے یا ان کی اولادوں نے حکومت وقت کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔

۶۲ ہجری میں مدینے کے مسلمانوں نے یزید کی غیر اسلامی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا لیکن ۶۳ ہجری میں یزیدی فوجوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر کے سیکڑوں صحابہ کرامؓ سمیت دس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہزاروں مسلمان بچے غلام اور مسلمانوں کی ہزاروں لڑکیاں کنیزیں بنالی گئیں۔ مسجد نبویؐ میں قبر رسولؐ کے قریب گھوڑوں کی غلاظت کے ڈھیر لگ گئے اور مسجد نبویؐ کا فرش مسلمانوں کے خون میں ڈوب گیا۔ اس وقت صرف دو افراد ایسے تھے جن سے بیعت کا سوال نہیں کیا گیا تھا۔ ایک سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کے بیٹے علیؑ ابن الحسینؑ اور دوسرے عبداللہ ابن عباسؓ کے بیٹے علی ابن عباسؓ۔

تاریخ اسلام کے اس شرمناک واقعے نے مدینے والوں سے زندہ رہنے کی امنگ ہی چھین لی تھی۔

فاتح کوفہ و شام حضرت زینبؑ بنت علیؑ اس واقعے سے ایک سال پہلے ہی شام میں شہادت پا چکی تھیں۔ آپؑ قید سے رہا ہونے کے بعد ساری زندگی روضہ رسولؐ یا قبر حسینؑ پر گزارنا چاہتی تھیں لیکن مدینے آ کر آپ نے ذکر سید الشہداءؑ کی مجلسیں برپا کرنا شروع کیں اور ان مجلسوں میں یزید کے ظلم وستم کو بیان کرنا شروع کیا تو مدینے میں موجود یزیدی خفیہ ایجنسیوں نے شام میں اپنے اعلیٰ حکام کو لکھا کہ اگر زینبؑ بنتِ علیؑ کی یہ مجلسیں اور عزاداری اسی طرح جاری رہی تو عوام حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

یزید نے عوام کی سیاسی بیداری کے خوف کی وجہ سے مدینے کے حاکم کو ہدایت کی کہ خاندان اہل بیتؑ کے تمام افراد کو ادھر ادھر منتشر کر کے ان کی طاقت کو توڑ دیا جائے۔ اسی حکم کے تحت جناب زینبؑ بنت علیؑ کو مدینہ بدر کر دیا گیا۔ بی بی زینبؑ اپنے شوہر جناب عبداللہ ابن جعفرؓ کے ساتھ پہلے مصر گئیں لیکن آپ کی عزاداری کی وجہ سے آپ کو مصر میں بھی نہیں رہنے دیا گیا۔ آخر آپ شام تشریف لے گئیں اور چند ماہ بعد ۶۲ ہجری میں آپ نے وہیں شہادت پائی۔

امام زین العابدینؑ حالات کے پیش نظر بہ ظاہر خاموشی لیکن درحقیقت بے حد فعال زندگی گزار رہے تھے۔ آپؑ نے دنیاوی سیاست میں دخل دینے کے بجائے دعاؤں کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا۔ آپ کو ایک ایک قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا تھا۔ آپؑ یزیدی حکومت کو کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ خاندانِ امامت کے افراد کو قتل کرنے کا کوئی موقع تلاش کر سکے۔

لیکن امام زین العابدینؑ کی اس بہ ظاہر خاموشی کے پیچھے بہت سے طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ اسلام کی رگوں میں دوڑنے والی منافقت کی جان لیوا بیماری کو فنا کرنے کے لئے دعا ہی نہیں دوا بھی تیار کی جارہی تھی۔ کوفے سے مختار ثقفی کی مسلح جدوجہد اور انتقامِ خونِ حسینؑ کی تحریک ایک تیز دھار نشتر تھا جس نے اسلام کی رگوں سے منافقت کے زہر کو باہر نکالنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

☆☆☆

منہال بن عمرو ۶۱ ہجری میں امام زین العابدینؑ سے ان کی قید کے دوران بھی مل چکے تھے۔ منہال اس زمانے میں آج کل کے اخباری رپورٹرز کی طرح کام کیا کرتے تھے۔ ایک دن جب امام زین العابدینؑ یزید کے دربار سے واپس قید خانے جارہے تھے تو منہال بن عمرو نے امام سے ملاقات کر کے ان کے تاثرات دریافت کیے تھے۔ ”نواسۂ رسولؐ ! آپ کا کیا حال ہے؟“

امام علیؑ ابن الحسینؑ نے اپنی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ”اس شخص کا کیا حال ہوسکتا ہے جس کے باپ کو شہید کردیا گیا ہو اور وہ بے یار و مددگار رہ گیا ہو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ میں قیدی ہوں۔ ایسا قیدی جس کے سرپرست دنیا میں نہیں رہے۔ میں نے اور میرے خاندان نے سوگ کا لباس پہن رکھا ہے۔“ امام علیہ السلام نے قید خانے کی طرف بڑھتے بڑھتے اپنے تاثرات بیان کیے۔

منہال بن عمرو آپ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ امام علیہ السلام ایک لمحے کو رک کے

اور فرمایا۔ ''منہال! عرب کے رہنے والے دوسروں کے سامنے فخر کیا کرتے تھے کہ اللہ کے آخری رسول محمدؐ ہم میں سے ہیں اور آج محمدؐ کے اہل بیتؑ کی حالت تمہارے سامنے ہے۔ آج ہم مظلوم بھی ہیں اور مقتول بھی۔ آج ایسا لگ رہا ہے جیسے ہماری کوئی فضیلت ہی باقی نہ رہی ہو۔ عزت، شہرت اور حکومت صرف یزید اور اس کے فوجوں کے لئے مخصوص ہوگئی ہو۔'' یہ کہہ کر امام زین العابدینؑ قید خانے کے پھاٹک میں داخل ہوگئے اور منہال افسردہ دل لیے وہاں سے لوٹ آئے۔

پھر وقت گزرتا رہا۔ اہل بیت رسولؐ شام کے قید خانے سے چھوٹ کر مدینے واپس آئے۔ انقلاب کی لہریں سارے ملک میں محسوس کی جانے لگیں۔ بی بی زینبؑ اپنے بھائی کو یاد کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ دشمن اسلام یزید ابن معاویہ جہنم کے شعلوں کا حصہ بن گیا۔ ابوسفیان کے خاندان سے بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔ مروان بن حکم ختم ہوگیا، اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان مسلمانوں کا بادشاہ بن گیا۔ ان چار پانچ برسوں میں اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ حسین علیہ السلام کا غم تھا۔

امام سید الساجدین حضرت علی ابن الحسینؑ کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا تھا کہ آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر نہ ہوں۔ پانی کو دیکھتے تو اپنے پیاسے باپ اور بہن بھائیوں کی یاد سے دل پھٹنے لگتا، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جسم سے ٹکراتا تو کربلا کی گرمی اور حبس یاد آجاتا۔ کھانا سامنے آتا تو عاشور کے دن اپنے عزیزوں کی بھوک پیاس یاد آجاتی۔ بازار میں کہیں کسی جانور کو ذبح ہوتے دیکھتے تو اپنے باپ اور بھائیوں کے خون میں ڈوبے ہوئے سر یاد آجاتے۔ کسی عورت کو اپنی چادر سنبھالتے دیکھتے تو اپنی پھوپھیوں کا بازار کوفہ و شام میں سر برہنہ قدم بڑھانا یاد آجاتا۔ کربلا کوفہ اور شام کے منظر ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے آتے اور آپ ضبط کرتے کرتے اچانک دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے۔

اب مدینے میں ان کے لئے کیا بچا تھا۔ خاندان کے سارے مرد اور بچے کربلا کی خاک پر سو رہے تھے۔ مدینے کی گلیاں ویران تھیں، گھر اجڑ چکے تھے۔ اب امام علیہ السلام

کے دو ہی کام تھے، اللہ کی عبادت اور شریعت کے معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا یا اپنے مظلوم باپ، چچاؤں اور بھائیوں کا ماتم کرنا۔

انہی دنوں منہال بن عمرو مکے سے ہوتے ہوئے مدینے پہنچے۔ اس زمانے میں کوفے میں مختار ثقفی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی یزیدی فوجی پکڑا جا رہا تھا۔ مختار ثقفی اس ظالم سے اس کے ظلم کا اعتراف کراتے اور پھر اسے اسی طرح مارا جاتا جس طرح اس نے کربلا میں امام حسین علیہ السلام یا ان کے ساتھیوں پر ظلم کیا تھا۔ انتقام خونِ حسینؑ کے اس سلسلے نے عراق و حجاز ہی نہیں مصر و شام میں بھی تہلکہ مچا رکھا تھا۔

یہ خبریں سینہ بہ سینہ مدینے میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور اہلِ حرم تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اہل حرم جب کسی ظالم کے انجام کو سنتے تو سجدہ شکر بجالاتے لیکن حضرت امام زین العابدینؑ کو چند سفاک یزیدی سرداروں اور فوجیوں کی موت کا شدت سے انتظار تھا۔ عمر ابن سعد، عبید اللہ ابن زیاد اور حرملہ بن کاہل ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے کربلا میں وحشت و بربریت کی انتہا کر دی تھی۔

منہال بن عمرو کوفے سے مکے آئے اور وہاں سے مدینے میں امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد امام علیہ السلام نے ان سے پوچھا ''حرملہ بن کاہل کی کیا خبر ہے؟''

''جب تک میں کوفے میں تھا اس کی تلاش جاری تھی۔'' منہال نے عرض کی۔

حرملہ ابن کاہل وہ سفاک انسان تھا جس نے حضرت امام حسینؑ کے چھ ماہ کے شیر خوار بچے علی اصغرؑ کو اپنے تین بھال کے تیر سے شہید کیا تھا۔ منہال کا جواب سن کر امام علیہ السلام نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے اس دشمن انسانیت کے لئے بددعا فرمائی۔ ''اے اللہ! حرملہ کو لوہے اور آگ کا مزہ چکھا دے.... اے اللہ اسے لوہے اور آگ کا مزہ چکھا دے۔'' اس وقت اپنے ننھے سے معصوم بھائی کو یاد کر کے امام علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

☆☆☆

منہال بن عمرو کوفے لوٹ آئے۔ مختار ثقفی جو اس وقت کوفے کے حکمران تھے۔ منہال کی ان سے ذاتی دوستی تھی۔ ایک صبح وہ مختار ثقفی سے ملنے کوفے کے دارالامارہ (گورنر ہاؤس) پہنچ گئے۔ مختار بڑی خوش دلی سے ملے اور بولے۔ ''ارے منہال! کوفے میں جب سے ہماری حکومت قائم ہوئی ہے تم ہم سے ملنے ہی نہیں آئے؟''

''میں کچھ دنوں کے لئے مکے چلا گیا تھا۔ ابھی کل ہی واپس آیا ہوں اور آج تمہیں مبارکباد دینے چلا آیا'' منہال نے جواب دیا۔

''خیر کوئی بات نہیں تم آ تو گئے' میں ذرا محلّہ کناسہ کی طرف جا رہا ہوں آؤ تم بھی ساتھ چلو'' مختار نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ضرور کیوں نہیں۔ میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گا'' منہال اپنی جگہ سے اٹھ کر مختار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ محلّہ کناسہ قریب ہی تھا۔ مختار اپنے سپاہیوں اور منہال کے ساتھ وہاں پہنچے ہی تھے کہ ان کی فوج کا ایک دستہ ایک شخص کو رسیوں میں باندھے ہوئے وہاں لے کر آ گیا۔

''کون ہے؟'' مختار نے غصے کے ساتھ پوچھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ گرفتار ہونے والا انہیں ظالموں میں سے کوئی ہے جنہوں نے کربلا میں نواسۂ رسولؐ اور ان کے ساتھیوں پر ظلم و ستم کیے تھے۔

''امیر! آپ کو مبارک ہو.... یہ حرملہ بن کاہل ہے۔'' کئی سپاہیوں نے بلند آواز میں کہا۔

امیر مختار کے ہونٹوں پر پہلے مسکراہٹ آئی اور پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''بدبخت انسان! تم حرملہ ہو؟'' انہوں نے اس شخص کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''ہاں! میں حرملہ ابن کاہل ہوں۔'' خوف کے مارے حرملہ کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

منہال بن عمرو بھی حرملہ کے قریب آ گئے۔ وہ اس ظالم انسان کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انسان کبھی واقعی درندوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ حرملہ انسانی شکل میں ایک درندہ تھا۔ جو شخص پیاس سے تڑپتے ہوئے شیر خوار بچے کو بے دردی سے قتل کر ڈالے اسے تو درندہ بھی کہنا شاید درندگی کی توہین ہوگی۔ منہال بن عمرو حیرت اور دکھ کے ساتھ اس وحشی درندے کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

حرملہ ابن کاہل کوفے کا رہنے والا تھا۔ تیر اندازی میں بے پناہ مہارت رکھتا تھا۔ اس کا نشانہ بہت کم خطا ہوتا تھا۔ کربلا میں یہ اپنے استاد ابو ایوب غنوی کے ساتھ موجود تھا۔ امام حسین علیہ السلام جب اپنے شیر خوار بچے کو اپنی عبا کے سائے میں لے کر آئے اور یزیدی درندوں سے مخاطب ہو کر کہا: "دیکھو! اگر میں تمہارا قصوروار ہوں تو یہ بچہ تو قصوروار نہیں ہے۔ یہ معصوم بچہ تین دن سے بھوکا پیاسا ہے۔ خدارا اس پر رحم کھاؤ اور اسے چند گھونٹ پانی پلا دو۔" یہ کہہ کر امام علیہ السلام نے اپنی عبا کا دامن اٹھایا اور حضرت علی اصغرؑ کا چہرہ فوج یزید کی طرف کر دیا۔

علی اصغرؑ نے اپنی آنکھوں کو گھمایا اور ان کے سوکھے ہوئے نیلے نیلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر ماں باپ اپنے بچوں پر صدقے واری ہونے لگتے ہیں۔ اس مسکراہٹ کو فوج یزید کے سپاہیوں اور سرداروں نے دیکھا تو ان کے دل حلق میں آنے لگے۔ جو لوگ قریب سے اس بچے کی حالت دیکھ رہے تھے ان کے پتھر دل پھٹ گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ساری فوج میں کھلبلی مچ گئی۔

عمر ابن سعد نے اپنی فوج کو حسین علیہ السلام کی مظلومیت سے متاثر ہوتے دیکھا تو ڈر گیا۔ اس نے سوچا کہ ایسا تو نہیں کہ جنگ ختم ہو گئی۔ ایسی جنگ جسے شاید وہ ہار چکا ہے۔ پھر اچانک ہی اس نے اپنے قریب موجود کوفے کے دو ماہر تیر اندازوں کی طرف دیکھا۔ ابو ایوب غنوی اور اس کا شاگرد حرملہ دونوں مستعد کھڑے تھے۔ ابو ایوب غنوی اپنے سردار کا

اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے ایک بھاری تیر کمان میں جوڑا اور اسے امام حسینؑ کے ہاتھوں میں پیاس سے تڑپتے ہوئے بچے کی طرف چلا دیا۔ لیکن اس کا تیر نشانے تک نہ پہنچ سکا۔ یہ دیکھ کر عمر ابن سعد زور سے چیخا۔ ''حرملہ! حسین کی تقریر کو اپنے تیر سے کاٹ دے۔''

بس اسی لمحے تین بھال کا ایک بھاری اور تیز دھار تیر حرملہ ابن کاہل کی کمان سے سنسناتا ہوا نکلا اور اگلے ہی لمحے معصوم بچے کی گردن کو کاٹتا ہوا حسین علیہ السلام کے بازو میں اتر گیا۔ معصوم بچہ ایک لمحے کو تڑپا اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ڈھلک گئی۔

☆☆☆

معصوم بچے کا یہ وحشی قاتل اس وقت مختار ثقفی کے سامنے کھڑا تھا۔ ''بد بخت انسان! تو نے میرے مظلوم شہزادے علی اصغرؑ کو اپنے تیر سے شہید کیا تھا، میں اب تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا....'' مختار ثقفی کی آواز غم و غصے سے بھرائی ہوئی تھی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تجھے میرے حوالے کر دیا۔ اب یہ بتا کہ اس کے علاوہ تو نے کیا کیا ظلم کیے تھے؟'' مختار نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر کیا۔

موت کو سامنے دیکھ کر حرملہ کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ''مجھے معاف کر دیں یا امیر.... مجھ سے غلطی ہو گئی....'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری بات کا جواب دے.... تو نے مزید کیا کیا ظلم کیے تھے۔'' مختار ثقفی نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''ایک بچہ اور بھی تھا جو میرے تیر سے ذبح ہو گیا....'' حرملہ نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''کون تھا وہ مظلوم؟'' مختار ثقفی شدت غم سے چیخ پڑے۔

''اس وقت تو مجھے پتا نہیں چلا تھا کہ وہ بچہ کون ہے۔ کوفے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس بچے کا نام عبداللہ تھا۔ یہ حسنؑ ابن علیؑ کا بیٹا تھا جو گھبرا کر خیمے سے نکلا۔ حسین اسے اپنی گود میں اٹھا کر واپس خیمے کے اندر لے جانا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ایک

تیر چلایا اور یہ بچہ اسی وقت خون میں نہا گیا۔'' حرملہ نے اپنے ظلم کی تفصیل بتائی۔

شدت ضبط سے مختار ثقفی کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں، آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے زن زن کی آوازوں کے ساتھ کئی تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں۔ ''اس کے دونوں ہاتھوں کو کاٹ دو۔ انہی ہاتھوں سے اس نے دو معصوم بچوں کو شہید کیا تھا۔'' مختار نے چیخ کر حکم دیا۔

دو تلواریں چمکیں اور حرملہ کے دونوں ہاتھ زمین پر گر گئے۔ ''اب اس کے ان پیروں کو کاٹ دو جن سے چل کر یہ نواسہ رسولؐ سے جنگ کرنے کو کربلا پہنچا تھا۔'' مختار کی آواز گونجی۔

دو تلواریں دوبارہ چمکیں، حرملہ کے گھٹنے زمین سے ٹکرائے اور وہ اپنے خون میں لوٹنے لگا۔ ''اب یہاں لکڑیاں لا کر آگ جلاؤ اور اس بدبخت کو آگ میں جلا کر فنا کر دو۔'' مختار نے حکم دیا۔ فوراً ہی لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی گئی اور حرملہ ابن کاہل کو آگ کے شعلوں میں ڈال دیا گیا۔

''منہال بن عمرو اب تک سانس روکے کھڑے تھے۔ دہشت اور خوف سے ان کی آواز غائب ہو گئی تھی لیکن جب حرملہ کو آگ میں ڈالا گیا تو ان کے دماغ میں ایک بجلی سی چمکی۔ انہیں حضرت علی ابن الحسینؑ کی وہ بددعا یاد آ گئی جو امامؑ نے حرملہ ابن کاہل کے لئے کی تھی۔ یہ بات یاد آتے ہی منہال کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....''

مختار نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ مختار کی آنکھوں میں خوشی اور غم کے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ''منہال! اللہ کی بڑائی ہر وقت کرنا چاہیے لیکن اس وقت تم نے عجیب موقع پر اللہ اکبر کہا۔''

''اے امیر! اس وقت مجھے علیؑ ابن الحسینؑ کی ایک دعا یاد آ گئی۔'' منہال نے جواب دیا۔

''کون سی دعا!'' مختار نے سوال کیا۔

''گزشتہ دنوں میں مکے گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر مدینے گیا پھر کوفے آیا۔ مدینے میں حضرت علی ابن الحسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ امام علیہ السلام نے وہاں مجھ سے حرملہ کے بارے میں معلوم کیا تھا کہ حرملہ گرفتار ہوا یا نہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ حرملہ ابھی زندہ ہے۔ اس وقت علیؑ ابن الحسینؑ نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کیے اور کہا: ''اے اللہ! حرملہ کو لوہے اور آگ کا مزہ چکھا دے۔''

مختار نے یہ بات سنی تو رونے لگے: ''پھر کیا ہوا منہال؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''بس پھر میں کوفے لوٹ آیا اور آج جب میں نے امام علیؑ ابن الحسینؑ کی دعا کو تمہارے ہاتھوں پورا ہوتے دیکھا تو بے اختیار میں نے کہا۔ اللہ اکبر''۔

یہ سن کر مختار ثقفی روتے روتے سجدے میں گر گئے۔ جب کافی دیر کے بعد انہوں نے اپنا سر سجدے سے اٹھایا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ یہ شکرانے کے آنسو تھے کہ اللہ نے سید الساجدین امام علی ابن الحسینؑ کی دعا کے نتائج کو ان کے ایک غلام کے ذریعے ظاہر کیا تھا!

☆☆☆☆☆